دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

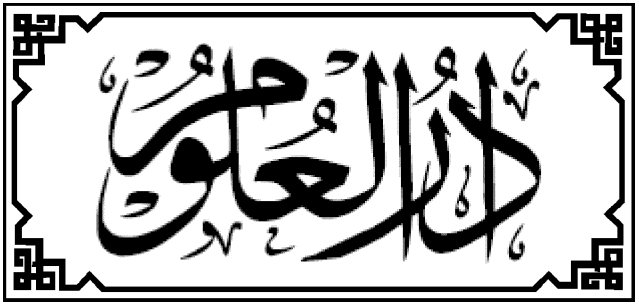

جلد: ۹۴	رمضان-ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ مطابق ستمبر-اکتوبر ۲۰۱۰ء	شمارہ: ۹-۱۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵ روپئے، سالانہ-/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز (ایک عظیم سانحہ)	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں	حبیب الرحمٰن اعظمی	۴
۳	عصر حاضر میں اسلامی قانون کی معنویت	اختر امام عادل قاسمی	۲۰
۴	قربانی کے سلسلے میں امت کا تعامل حقائق، مسلّمات اور غلط فہمیاں	مفتی رشید احمد فریدی	۳۴
۵	کیا تعلیمات نبوی ﷺ پر مسیحیت کا اثر ہے؟	ڈاکٹر شمیم اختر قاسمی	۵۰
۶	انکارِ حدیث کیوں؟	مولانا محمد یوسف لدھیانوی	۷۰
۷	اکابر دیوبند کیا تھے؟	مولانا محمد تقی عثمانی	۸۷
۸	فلسطین...تاریخ کے آئینے میں	مولانا برید احمد نعمانی	۱۰۱
۹	میرے قابل احترام اساتذۂ کرام	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	۱۰۶
۱۰	بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	...	۱۱۲

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ● چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- ● پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ایک عظیم سانحہ

۲۸/شوال مطابق ۸/اکتوبر بروز جمعہ تقریباً ساڑھے پانچ بجے شام دارالعلوم دیوبند کے کارگزار مہتمم جناب حضرت مولانا غلام رسول خاموش پالن پوری مختصر سی علالت کے بعد بعمر ۷۲ سال اس جہانِ بے اماں سے رحلت کرگئے۔ انّا للّٰہ وانا الیہ راجعون. اللھم اغفرلہ وارحمہ، واکرم نزلہ و وسع مدخلہ، وانزل علی روحہ وجسدہ شأبیب رحمتك، واجعلہ من عبادك المقربین، آمین یا ارحم الراحمین.

مرحوم ومغفور ایک طویل عرصہ سے دارالعلوم دیوبند کی سب سے بااختیار باڈی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی کی مسلسل علالت اور ضعف پیری کے پیش نظر انہیں ذمہ داریوں کے بارگراں سے فی الجملہ راحت دینے کی غرض سے مجلس شوریٰ نے حسب دستور اپنی صف سے ایک معزز، معاملہ فہم، اور انتہائی دیندار فرد یعنی مولانا خاموش صاحب مرحوم کو کارگزار مہتمم مقرر کردیا تھا، مولانا موصوف تقریباً سات سال تک اس منصب پر رہ کر لوجہ اللہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت کرتے رہے، مولانا کے مزاج میں بیحد سلامت روی تھی، چھوٹے اور بڑے سب کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کرتے تھے، طلبہ کے راحت واطمینان کی جانب بطور خاص توجہ فرماتے تھے، حضرت مہتمم صاحب کا اس درجہ پاس ولحاظ فرماتے تھے کہ بغیر ان سے استصواب کیے بالعموم کوئی حکم نافذ نہیں فرماتے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی جس کا وہ اظہار بھی کیا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے جملہ کارکن وخدمت گزار باہم میل ومحبت کے ساتھ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہیں۔

نماز مغرب سے عشاء تک ذکر ونوافل میں مشغول رہنے کا معمول تھا جس میں کم ہی تخلف ہوتا تھا، نماز عشاء سے فراغت کے بعد ہی مسجد سے قیام گاہ پر آتے تھے اور پھر کھانا تناول کرتے تھے۔ اسی طرح شب خیزی کا بھی معمول تھا، عموماً آخر شب تین بجے بستر چھوڑ دیتے تھے اور نماز اشراق تک مصرف عبادت رہتے تھے۔

مولانا مرحوم جامعہ اسلامیہ بنوری گاؤں کراچی سے فارغ التحصیل تھے، حدیث کی کتابیں محدث عصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے پڑھی تھیں، حضرت بنوری کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، جماعت تبلیغی سے بھی سرگرم وابستگی تھی، افسوس صد افسوس کہ ان اوصاف وکمالات کی حامل وجامع شخصیت ہم سے جدا ہوگئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی مغفرت ورحمت سے شاد کام فرمائے، اور دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا کرے، اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور ثواب جزیل بخشے، آمین۔

بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں

﴿۱﴾

مسجد کی تعمیر اور اس کی تاریخی حیثیت

تین گنبدوں والی یہ قدیم مسجد شہنشاہ ''بابر'' کے دور میں اودھ کے حاکم ''میر باقی اصفہانی'' نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی تھی، مسجد کے مسقّف حصہ میں تین صفیں تھیں اور ہر صف میں ایک سو بیس نمازی کھڑے ہوسکتے تھے، صحن میں چار صفوں کی وسعت تھی، اس طرح بیک وقت ساڑھے آٹھ سو مصلی نماز ادا کرسکتے تھے۔

مسجد کے درمیانی مرکزی در کے اوپر دو میٹر لمبی اور پچپن سینٹی میٹر چوڑی پتھر کی تختی کا ایک کتبہ نصب تھا، جس کی پہلی اوپر سطر میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ ثقتی'' خوشنما بیلوں کے درمیان لکھا ہوا تھا، اور نیچے کی تین سطروں میں یہ اشعار تھے۔

بنام آنکہ او دانائے اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستائش — کہ سرور انبیاء زبدہ جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دور گیتی کامرانی

چنانکہ ہفت کشور در گرفتہ زمیں را چوں مثالے آسمانی
درآں حضرت یکے میر معظم کہ نامش میر باقی اصفہانی
مشیرِ سلطنت تدبیر ملکش کہ ایں مسجد حصار ہست بانی
خدایا در جہاں تابندہ ماند کہ چتر وتخت و بخت و زندگانی
دریں عہد و دریں تاریخ میموں کہ نہ صد پنج و سی بودہ نشانی

تمت ہذا التوحید ونعت ومدح وصفت نوراللہ برہانہ بخط عبدالضعیف نحیف فتح اللہ محمد غوری۔

اس بڑے کتبہ کے علاوہ اندرونِ مسجد منبر کی دونوں جانب ایک ایک کتبہ نصب تھا، ۲۷/مارچ ۱۹۳۴ء کے ہنگامہ کے موقع پر جوگاؤکشی کے عنوان کا بہانہ بنا کر برپا کیا گیا تھا، مسجد میں گھس کر بلوائیوں نے توڑ پھوڑ کی تھی، جس میں یہ دونوں کتبے بھی اٹھالے گئے تھے، بعد میں ''تہور خاں ٹھیکیدار'' نے منبر کی بائیں سمت والے کتبہ کی نقل تیار کرا کے اسی پہلی جگہ پر اسے نصب کرادیا، داہنی جانب کے کتبہ کی ایک نقل سید بدرالحسن فیض آبادی کے پاس محفوظ تھی، اس لئے اس کتبہ کی عبارت بھی دستیاب ہوگئی۔

بائیں سمت کا کتبہ حسب ذیل اشعار پر مشتمل تھا۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

داہنی جانب والے کتبہ کے اشعار یہ تھے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں بنائے کہ با کاخ گردو عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار امیر سعادت نشاں میر خاں
بماند ہمیشہ چنیں بانیش چناں شہر یارِ زمیں و زماں

ابتدائے تعمیر سے بابری مسجد میں نماز پنج گانہ اور جمعہ ہوتا رہا ہے، عدالتی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۰ء تک اس مسجد کے امام وخطیب ''محمد اصغر'' تھے، ۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت میں مولوی ''عبدالرشید'' نے امامت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء کے عرصہ میں یہ خدمت مولوی عبدالقادر کے سپرد رہی، اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء مسجد کے قرق ہونے کی تاریخ تک مولوی عبدالغفار کی اقتداء میں مسلمان اس مسجد

میں نماز پنج وقتہ اور جمعہ ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد کے مصارف کے واسطے عہد مغلیہ میں مبلغ ساٹھ روپے سالانہ شاہی خزانے سے ملتے تھے، نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپے تین آنہ چھ پائی کردی گئی تھی، برطانوی اقتدار میں بھی یہ رقم بحال رہی، پھر بندوبست اول کے وقت نقد کی بجائے دو گاؤں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا اس کے مصارف کے لئے دیئے گئے، غرض کہ اپنی ابتدا، تعمیر ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء سے ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء تک یہ مسجد بغیر کسی نزاع واختلاف کے مسجد ہی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک مقدس ومحترم عبادت گاہ رہی اور مسلمان امن وسکون کے ساتھ اس میں اپنی مذہبی عبادت ادا کرتے تھے۔

﴿۲﴾

مسجد، مندر قضیہ کا آغاز

مستند تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے صدیوں پہلے مسلمان اجودھیا میں آباد تھے، اور یہاں کے ہندو مسلم پوری یک جہتی اور یگانگت کے ساتھ رہتے سہتے تھے، ۱۸۵۵ء / ۱۲۷۲ھ سے پہلے کسی مذہبی معاملہ میں یہاں کے باشندوں کے درمیان کوئی تنازعہ رونما ہوا یا باہمی ٹکراؤ کی نوبت آئی ہو صحیح تاریخوں اور مذہبی نوشتوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، لیکن جب اس ملک پر انگریزوں کا منحوس سایہ پڑا اور ان کا یہاں عمل دخل شروع ہوا تو انھوں نے اپنی بدنام زمانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے تحت یہاں کے لوگوں میں باہمی منافرت اور تصادم پیدا کرنے کی غرض سے مسجد، مندر، جنم استھان وغیرہ کا خود ساختہ قضیہ چھیڑ دیا جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۵ء / ۱۲۷۲ھ میں اجودھیا کے اندر زبردست خونریزی ہوئی، جس کی تفصیل احقر کی تالیف ''اجودھیا کے اسلامی آثار'' میں ملاحظہ کی جائے، اسی وقت سے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، اور نوبت بایں جارسید۔

شاطر انگریزوں نے سب سے پہلے ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' کا افسانہ ترتیب دیا اور ایک بدھسٹ نجومی کو پہلے سے سکھا پڑھا کر ان دونوں مقامات کی جگہ معلوم کی، اس نے طے شدہ سازش کے مطابق زائچہ کھینچ کر بتادیا کہ ''جنم استھان'' اور ''سیتا کی رسوئی'' بابری مسجد سے متصل احاطہ کے اندر ہے، پھر اپنے زیر اثر ہندوؤں کو اکسایا کہ ان دونوں ''پوتر استھانوں'' کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، ''نقی علی خاں'' جو نواب واجد علی کا خسر اور وزیر تھا، انگریزوں کی اس

سازش میں ان کا مؤید اور طرف دار تھا، اس نے اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ ناعاقبت اندیش نواب کو اس بات پر راضی کرلیا کہ بابری مسجد سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر جنم استھان وسیتا رسوئی کے لئے جگہ دیدی جائے، چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل احاطہ مسجد کی دیوار سے متصل داہنی سمت ''سیتا رسوئی'' کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی جانب جنم استھان کے نام سے ۲۱×۱۷ فٹ لمبی اور ۱۷×۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی، جس پر اسی وقت سے پوجا پاٹ کا سلسلہ بھی شروع کردیا گیا، حالانکہ جس وقت یہ افسانہ ایجاد کیا گیا اس سے برسہا برس پہلے سے قلب شہر میں جنم استھان کا مندر موجود تھا اور آج بھی موجود ہے، اس وقت مسجد اور جنم استھان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی غرض سے صحن مسجد کے اردگرد آہنی سلاخوں کی باڑھ کھڑی کردی گئی، اسی منحوس تاریخ سے اجودھیا میں مذہبی کش مکش شروع ہوگئی اور یہاں کے ہندو مسلم، مندر مسجد کے نام پر آپس میں دست بگریباں ہوگئے۔

خدا سمجھے بت سحر آفریں سے
گریباں کو لڑایا آستیں سے

۱۸۵۷ء میں جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے متحد ہوکر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا بگل بجایا، ضلع فیض آباد کے گزیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت باہمی اتفاق ویگانگت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اجودھیا کے مسلم رہنما امیر علی اور ہندو رہنما بابا چرن داس نے رام جنم استھان اور بابری مسجد کے تنازعہ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ کیا کہ رام جنم استھان کی مخصوص متنازعہ اراضی ہندوؤں کے حوالہ کردی جائے اور ہندو بابری مسجد کی عمارت سے دست کش ہوجائیں، چنانچہ اس معاہدہ پر فریقین خوشی خوشی راضی ہوگئے اور دوسال سے اختلاف کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ ٹھنڈی ہوگئی، مگر انگریزوں کو یہ ہندو مسلم اتحاد گوارہ نہ ہوا، انھوں نے بابا رام چرن داس اور امیر علی دونوں کو ایک ساتھ املی کے پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دیدی اور مندر مسجد کے نزاع کو از سرنو زندہ کرنے کی غرض سے متنازعہ رام جنم استھان اور بابری مسجد کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، دونوں کے راستے بھی الگ الگ بنادیئے اور مسجد کے شمالی دروازہ سے مسجد میں داخلہ پر پابندی عائد کردی، اور —— جذباتی ہندوؤں کو اکسایا کہ وہ اس تقسیم کو مسترد کرکے پوری مسجد پر دعویٰ کریں، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بھی برانگیختہ کیا کہ وہ مسجد کی اراضی کے اس بٹوارہ کو تسلیم نہ کریں چنانچہ یہ کشاکش پھر شروع ہوگئی جس کا ایک طویل سلسلہ ہے، تفصیل کے لئے ''اجودھیا کے اسلامی آثار'' کا مطالعہ کیجئے۔

﴿۳﴾

مسجد کو مندر بنانے کی شرمناک سازش

۱۹۴۸/۴۹ء میں جب کہ ملک فرقہ وارانہ تشدّد کی آگ میں جل رہا تھا، اور پورے ہندوستان میں افراتفری مچی ہوئی تھی ۲۲، ۲۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت ''ابھے رام داس'' نے اپنے کچھ چیلوں کے ساتھ مسجد میں گھس کر عین محراب کے اندر ایک مورتی رکھ دی جس کے خلاف اس وقت ڈیوٹی پر مقرر کانسٹبل ''ماتو پرشاد'' نے صبح کو تھانہ میں حسب ذیل رپورٹ درج کرائی۔

''ابھے رام داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم لوگوں نے مسجد کے اندر مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے۔ جس سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔''

اس رپورٹ کو بنیاد بنا کر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر کے مقفل کر دیا اور پریہ دت رام چیرمین کو اس کی حفاظت کے لئے رسیور مقرر کر دیا، نیز فریقین کے نام نوٹس جاری کیا کہ اپنے اپنے دعویٰ پر ثبوت پیش کریں، سٹی مجسٹریٹ کا یہ غیر منصفانہ عمل زبان حال سے بتا رہا ہے کہ مسجد میں بت رکھنے کی کارروائی گہری سازش کے تحت عمل میں لائی گئی تھی، ورنہ ایک قدیم جمعہ و جماعت سے آباد مسجد کے بارے میں ثبوت طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ ماتو پرشاد کانسٹبل کی رپورٹ کے مطابق مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جاتی اور مسجد سے مورتی نکال کر اس مسئلہ کو ختم کر دیا جاتا، مگر حیرت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سنگین معاملہ پر توجہ دلائی اور انھوں نے یوپی کے وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت کو لکھا کہ اس مسئلہ کو فی الفور حل کریں، پھر بھی اس سلسلے میں کوئی مثبت کارروائی نہیں کی گئی، اور مذہبی جانبداری و اقتدار سیکولرزم اور قانون و انصاف پر غالب رہا، گویا ملک کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کا اولین صلہ آزاد ہونے کے بعد یہ دیا گیا کہ ان کی قدیم متبرک عبادت گاہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور اس کے منبر و محراب جواب تک رکوع و سجود سے آباد تھے مقفل کر دیئے گئے۔

دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجام کار

اس حادثہ کے وقت مولانا آزاد نے کہا تھا کہ ''میرے ذہن میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ

مستقبل میں مسلمانوں کو ایک ملت کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو بابری مسجد سے بت ہٹا دیئے جائیں گے، اور اگر آئندہ چل کر اس کی نفی ہوتی ہے تو انتظار کیجئے دوسری مسجدوں میں بھی اس طرح کے حادثات پیش آسکتے ہیں۔'' آج کے واقعات سے مولانا آزاد کے خدشات صحیح ثابت ہورہے ہیں۔

اس حادثہ کے بعد ۱۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ نامی ایک شخص نے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسن عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی، ایم سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کردیا کہ مسجد جنم استھان ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر مسلمان اور ضلع حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کرکے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کی باضابطہ اجازت دی جائے، اس مقدمہ کے دائر ہونے کے تیسرے دن یعنی ۱۹؍جنوری ۱۹۵۰ء کو عدالت نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ ہندو مسلمان دونوں کا داخلہ مسجد میں ممنوع قرار دے دیا پھر ۱۳؍مارچ ۱۹۵۱ء میں عدالت نے پجاری کو مسجد کے اندر جاکر پوجا اور بھوگ کرنے کی اجازت دیدی، مگر مسلمان اپنی عبادت گاہ میں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کا نام لینے سے محروم رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ظلم و ناانصافی کو طاقت وحکومت کی پشت پناہی حاصل ہوجاتی ہے تو آئین و قانون اور عدالت سب اس کے آگے سربسجود ہوجاتے ہیں۔

دعویٰ مذکورہ کی جواب دہی کرتے ہوئے فیض آباد کے ایس پی کرنا سنگھ نے یکم جون ۱۹۵۰ء کو جو جواب دعویٰ عدالت میں داخل کیا اس میں لکھا تھا کہ

''زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے اس میں مسلمان ہمیشہ سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔''

ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اسی مقدمہ سے متعلق یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو جو حلف نامہ داخل کیا تھا اس میں بھی ''بابری مسجد'' کی مسجدیت کا اعتراف واقرار موجود ہے، مذکورہ بالا مقدمہ کے علاوہ ۱۹۶۱ء میں دو مزید مقدمات دائر کئے گئے ایک رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے، جس کے جواب میں جمعیۃ علماء ہند اور یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی جانب سے بھی مقدمات قائم کئے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ بابری مسجد مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے رہے ہیں لہٰذا یہ مسجد انھیں واپس دی جائے اور نماز وغیرہ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

تقریباً ۳۵؍سال کے طویل عرصہ تک یہ مقدمات عدالت میں معطل پڑے رہے،....ان سے

متعلق کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی گئی، اس دوران پولیس اور رسیور کی نگرانی کے باوجود مسجد کے اندر اور باہر خلاف قانون بہت سی تبدیلیاں کردی گئیں، مثلاً مسجد کے صدر دروازہ پر جلی حرفوں میں ''اللہ'' کندہ تھا جسے کھرچ دیا گیا، دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگادیا گیا، احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور مسجد کی درمیانی جگہ میں سفید وسیاہ سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا جسے پری کرما کا نام دیا گیا، صحن مسجد میں اتر جانب ایک ہینڈ پائپ نصب کرلیا گیا، مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر اور مندر کے پجاری کے لئے ایک کمرہ تعمیر کرلیا گیا دکھن جانب نام نہاد جنم استھان کے چبوترہ پر بھی ایک مندر بنالیا گیا اور مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک بھگوا جھنڈا لگادیا گیا یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۶ء کے درمیانی عرصہ میں کی گئیں مگر رسیور، انتظامیہ اور عدالت کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

﴿۴﴾

عدالت نے اقتدار کے دباؤ میں مسجد کے اندر مورتی پوجا کی غیر منصفانہ اجازت دیدی

مسلمانوں کو کسی حد تک اطمینان تھا کہ مسجد مقفل ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے مقدمات کی سماعت ہورہی ہے، عدلیہ اس بارے میں جو فیصلہ کرے گی اسے تسلیم کرلیا جائے گا، کیونکہ عدلیہ پر ان کا اعتماد ابھی مجروح نہیں ہوا تھا، اسی پرامن ماحول میں ۲۵ رجنوری ۱۹۸۶ء کو ''رمیش پانڈے'' ایک غیر متعلق شخص نے جو بابری مسجد سے متعلق کسی بھی مقدمہ میں فریق نہیں تھا صدر منصف فیض آباد کی عدالت میں یہ درخواست گذاری کہ

> ''جنم استھان میں پوجا پاٹ کی اجازت ہونی چاہئے اس لئے عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ میں اور دوسرے ہندو بغیر کسی رکاوٹ کے پوجا کرسکیں۔''

صدر منصف نے یہ کہہ کر درخواست مسترد کردی کہ ''اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا'' منصف کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر کے، ایم، پانڈے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ۳۰ رجنوری ۱۹۸۶ء کو اپیل دائر کی گئی ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو پونے بارہ بجے یہ یکطرفہ فیصلہ سنادیا کہ ''ضلع انتظامیہ تالا کھول دے اور رمیش پانڈے و دیگر پجاریوں کو پوجا پاٹ کی عام اجازت دی جائے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کے لئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔''

اس غیر عادلانہ فیصلے کے بعد بغیر کسی تاخیر کے ۵؍بجکر ۱۹؍منٹ پر بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا جو ۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے نفاذ میں لگایا گیا تھا اور ہزاروں ہندو جو وہاں جمع کئے گئے تھے پوجا پاٹ کے لئے مسجد میں داخل ہوگئے، تالا کھولنے کی اس شرمناک تقریب کو ہمارے سیکولر ملک کے نشریاتی ادارہ ''دور درشن'' نے بڑے اہتمام سے نشر کیا تاکہ مسلمانوں کے زخمی دلوں پر اچھی طرح سے نمک پاشی ہوجائے، علاوہ ازیں پورے ملک میں اس کا جشن منایا گیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو شکست دیدی گئی، اس کھلی ہوئی بے انصافی پر مسلمانوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا تو رائفل کی گولیوں سے احتجاج کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا گیا، خاص طور پر بارہ بنکی، بنارس، بنگلور وغیرہ شہروں میں سرکاری پولیس نے مسلمانوں کے خلاف دردناک بہیمیت کا برتاؤ کیا، بعد میں یہ بات عام طور پر مشہور ہوگئی کہ سیکولرزم کی علمبردار کانگریس حکومت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش اور ایک مرکزی وزیر کے اشارے پر تالا کھولا گیا تھا، آئندہ کے واقعات ومشاہدات نے واضح کردیا کہ یہ شہرت بے بنیاد نہیں تھی۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ بغیر مضبوط سیاسی پشت پناہی کے عدالت کو اس طرح سے قانون و انصاف کی دھجیاں اڑانے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔

﴿۵﴾

مسجد کو مسمار کرکے اسکی جگہ پر رام مندر بنانے کا مجرمانہ اعلان وسرگرمیاں

مسجد میں عام پوجا پاٹ کی اجازت حاصل ہوجانے سے ہندو احیاء پرستوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور اب ایک قدم آگے بڑھا کر مسجد کو منہدم کرکے اس کی جگہ نیا مندر بنانے کی تشدد آمیز جدوجہد شروع کردی گئی، حکومتوں کے تجاہل اور دورخی پالیسی کی بنا پر انھیں مزید حوصلہ ملا، چنانچہ وشوہندو پریشد کے سربراہ سنگھل نے دھمکی کی زبان میں یہ کھلا اعلان کیا کہ ۹؍نومبر ۱۹۸۹ء کو مندر کا شلا نیاس (سنگِ بنیاد) ہوگا، اور ملک کی کسی سیاسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ ہمارے اس پروگرام کو روک دے عام ہندوؤں کو ہم نوا بنانے کی غرض سے پروگرام یوں ترتیب دیا گیا کہ ۳۰؍ستمبر ۱۹۸۹ء سے ملک گیر شلا پوجن مہم شروع کی جائے جس کے تحت ملک بھر کے پانچ لاکھ پچھتّر ہزار گاؤں میں ایک ایک شلا (اینٹ) بھیج کر اس کا پوجن کرایا جائے اور دیوا ستھان اکادشی (۹؍نومبر) کے دن یہ ساری اینٹیں اجودھیا پہنچادی جائیں اور اسی دن رام مندر کا شلا نیاس کیا جائے، وشوہندو پریشد وغیرہ جارحیت پسند تنظیمیں اپنے سربراہ کے اعلان کے مطابق شلا پوجن کے نام پر گاؤں گاؤں

گھوم کر نفرت وتشدد کا زہر پھیلاتی رہیں اور ہماری سیکولر حکومتیں اپنی خاموشی سے ان کا تعاون کرتی رہیں تا آنکہ کانگریسی حکومت کے وزیر داخلہ نے متعینہ تاریخ یعنی ۹/نومبر کو وشوہندو پریشد کے ہاتھوں متنازعہ اراضی پر شلانیاس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگاہ کردیا کہ بابری مسجد کے انہدام اور مندر کی تعمیر کا وقت قریب آگیا ہے، وزیر داخلہ نے اس سلسلہ میں حیرت ناک حد تک گمراہ کن رویہ اختیار کیا، ایک طرف تو وہ اعلان کرتے رہے کہ متنازعہ جگہ پر شلانیاس کی اجازت نہیں دی جائے گی اور دوسری طرف اندر اندر وشوہندو پریشد سے ساز باز بھی کرتے رہے، حکومت کی اس منافقانہ پالیسی نے فرقہ پرست تنظیموں کو اس قدر جری بنادیا کہ ۲۳/جون ۱۹۹۰ء کو ہری دوار میں ہندو مذہبی لیڈروں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر طے کیا کہ اگست سے اکتوبر تک پورے ملک میں جگہ جگہ جلوس نکالے جائیں، گاؤں گاؤں سے مندر کی تعمیر کے لئے والنٹیر جمع کئے جائیں، اور ۳۰/اکتوبر کو مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا کام شروع کردیا جائے، اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آر، ایس ایس، بی، جے، پی، وشوہندو پریشد، بجرنگ دل اور ان کی ہم نوا تمام فرقہ پرست پارٹیاں میدان میں نکل پڑیں، بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن ایڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک کی رتھ یاترا شروع کی، اس رتھ یاترا میں انتہائی اشتعال انگیز اور دل خراش تقریریں کی گئیں، جس کے نتیجہ میں بڑودہ، بنگلور، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور یوپی کے بعض اضلاع میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی، لیکن حکومت وقت جس کی اولین واہم ترین ذمہ داری اپنے شہریوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت ہے خود اپنی حفاظت کے بندوبست اور اپنی جان بچانے کی فکر میں مصروف رہی اور جارحیت کا عفریت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر آگ وخون کا طوفان برپا کرتا رہا بہرحال اعلان کے مطابق بھاری تعداد میں کارسیوک ۳۰/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو اجودھیا پہنچ گئے، اور بابری مسجد کو مسمار کرنے کی اپنی جیسی کوششیں بھی کیں، حتی کہ مسجد کے گنبدوں اور دیواروں کو مجروح بھی کردیا، مگر وزیر اعلیٰ یوپی کے سخت رویہ کی وجہ سے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے قابل تعریف ہمت وجرأت کا ثبوت دیا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر نہ صرف بابری مسجد کو بچالیا بلکہ سیکولر اور جمہوری قدروں کی آبرو رکھ لی رام بھگت اور کارسیوک کے نام سے اجودھیا میں اکٹھا بلوائی جب بابری مسجد کے انہدام میں ناکام ہوگئے تو انھوں نے اپنا غصہ مسلمانوں پر اتارا، اور پی، اے، سی کے تعاون سے ملک گیر فساد برپا کردیا جس میں سینکڑوں مسلمان شہید کئے گئے اور ان کی کروڑوں کی جائیدادیں لوٹ لیں، یا نذر آتش کردی گئیں، وی، پی سنگھ جنھوں نے بھاجپا کے اشتراک سے حکومت بنائی تھی اپنے اقتدار کو

بچانے کی غرض سے منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے، لیکن ان کا یہ بزدلانہ رویہ ان کی کرسیٔ اقتدار کو نہ بچاسکا، نفرت کی آگ نے ملک کے امن کے ساتھ اسے بھی بھسم کردیا۔

وی، پی سنگھ سرکار کے خاتمہ کے بعد چندر سیکھر نے زمام اقتدار سنبھالی انھوں نے اپنے عہد حکومت میں یہ کام کیا کہ وشوہندو پریشد اور اس کی حلیف پارٹیوں کو (جنھوں نے روز اول سے تشدد کی راہ اختیار کرکے نہ صرف مصالحانہ گفت وشنید کا دروازہ بند کررکھا تھا بلکہ عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھیں) بات چیت پر راضی کرلیا، چنانچہ ان کے اور ایکشن کمیٹی بابری مسجد کے لیڈروں کے درمیان براہ راست گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، فریقین نے اپنے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تحریری دلائل بھی فراہم کئے، گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ چندر سیکھر حکومت ہی ختم ہوگئی، بالآخر ملک میں الیکشن ہوا جس کے نتیجہ میں کلیان سنگھ کی زیر سرکردگی یوپی میں بھاجپا کی حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں کانگریس نے سیکولرزم کی علامت نرسمہاراؤ کی قیادت میں حکومت بنائی۔

﴿۶﴾

بابری مسجد کی المناک شہادت

بھارتیہ جنتا پارٹی اپنی فرقہ پرست ذہنیت کی بنا پر ہمیشہ ہی سے بابری مسجد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اسے غلامی کی علامت قرار دیتی تھی، اب ریاست میں اس کی حکومت تھی اس لئے وہ اس مسجد کو کیونکر برداشت کرسکتی تھی، چنانچہ بھاجپائی وزیراعلیٰ کلیان سنگھ نے وزارت سازی کے بعد جو اولین کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر اجودھیا آئے اور بابری مسجد میں نصب مورتی کے پاس کھڑے ہوکر یہ عہد کیا کہ ''رام للہ ہم آئیں گے مندر یہیں بنائیں گے'' اس عہد وپیمان کے بعد کلیان سنگھ حکومت نے قانون وانصاف کو نظر انداز کرکے رام مندر کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کی مہم شروع کردی، بابری مسجد سے ملحق موقوفہ متنازعہ اراضی کو اپنی تحویل میں لے لیا، پھر اسے وشوہندو پریشد کے حوالہ کردیا، جس پر مستحکم بنیادوں کے ساتھ پختہ چبوترہ کی تعمیر کا کام نہایت زور وشور کے ساتھ جاری ہوگیا، جبکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات تھے کہ متنازعہ جگہ پر کسی قسم کی تعمیر نہ کی جائے، توہین عدالت کا ارتکاب کرتے ہوئے تعمیر ہوتی رہی اور مسلم لیڈران اس غیر قانونی اقدام پر مرکزی سرکار سے احتجاج کرتے رہے، لیکن مرکزی حکومت نے اس وقت تک کوئی مؤثر حرکت نہیں کی جب تک کہ وشوہندو پریشد نے اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کرلی۔

چبوترہ کی تعمیر کے بعد وزیراعظم نے فریقین کے درمیان از سرنو مذاکرات کا سلسلہ شروع

کرایا جس کے دو دور حکومت کے ترجمان کے بقول اطمینان بخش اور امید افزا رہے، تیسرے دور کا آغاز ہونے والا ہی تھا کہ اچانک حیرتناک انداز میں وشوہندو پریشد نے یکطرفہ اعلان کردیا کہ ۶ ردسمبر ۱۹۹۱ء کو کارسیوا ہوگی، ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد گفت وشنید کی کیا گنجائش تھی، اس لئے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، کارسیوا کے اعلان ہوتے ہی ساری فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آگئیں۔ بھاجپا کے سابق صدر ایڈوانی اور جوشی یاترا پر نکل پڑے، تخریب کار عناصر کارسیوک کے نام پر اجودھیا میں جمع ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کا ماحول کشیدہ وسراسیمہ ہوگیا۔

یوپی کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے عدالت اور مرکزی حکومت کو حلفیہ اطمینان دلایا کہ کارسیوا صرف علامتی ہوگی، عدالت اور مرکزی حکومت کے حکم کی سرمو خلاف ورزی نہیں ہوگی، مرکزی وزیر داخلہ قوم کو اطمینان دلاتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت کا پورا منصوبہ مرتب کرلیا گیا ہے، سیکولر نواز وزیر اعظم ہند بھی اعلان پر اعلان کرتے رہے کہ بابری مسجد کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے مرکز سے اچھی خاصی تعداد میں فوج بھی اجودھیا پہنچ گئی مگر اسے نامعلوم مصالح کی بنیاد پر بابری مسجد سے دوڈھائی کلومیٹر دور رکھا گیا، صوبہ اور مرکز کے نیم فوجی دستے مسجد کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں سمت میں متعین کئے گئے مگر انھیں وزیر اعظم کی سخت ہدایت تھی کہ رام بھگتوں پر کسی حال میں بھی گولی نہ چلائی جائے۔

بہر حال ان سارے اعلانات وانتظامات کے سائے میں ۶ ردسمبر کی وحشتناک تاریخ آگئی، ایڈوانی، سنگھل، ونے کٹیار، اوما بھارتی وغیرہ دولاکھ کارسیوکوں کی فوج لئے اجودھیا کے میدان میں پہلے ہی سے موجود تھے، ان لیڈروں کی رہنمائی میں کارسیوا شروع ہوئی اور تشدد پر آمادہ تربیت یافتہ کارسیوکوں نے گیارہ بج کر پچپن منٹ پر بابری مسجد پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی مزاحمت کے پورے اطمینان سے چار بجے تک اسے توڑتے اور ملبہ کو دور پھینکتے رہے یہاں تک کہ صفحۂ زمین سے بابری مسجد کا نام ونشان ختم کردیا گیا۔

وزیر داخلہ اور وزیر اعظم کو ایک ایک منٹ کی خبر پہنچتی رہی مگر نہ مسجد کی حفاظت کا مرتبہ منصوبہ روبہ عمل آیا اور نہ ہی اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا فریضہ ادا کیا گیا، اس طرح ۲۲/۲۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو بابری مسجد کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی، ۶ ردسمبر ۱۹۹۱ء کو سیکولرزم وجمہوریت کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کا منصوبہ چونکہ پورا ہو چکا تھا اس لئے وہ حکومت سے دست بردار ہوگئے، نظم ونسق کی ذمہ داری مرکز کے سر آگئی، صدر راج کا نفاذ ہوگیا، اس کے باوجود تقریباً ۳۸

گھنٹے تک اجودھیا مکمل طور پر کارسیوکوں کے تصرف میں رہا جنھوں نے اجودھیا کی دیگر بہت ساری مسجدوں کو بھی بالکل مسمار کردیا یا توڑ پھوڑ کر اپنے خیال میں ناقابل استعمال بنادیا، اور اجودھیا میں آباد مسلم گھرانوں کو تہس نہس کرڈالا، اسی وقفہ میں بابری مسجد کی جگہ پر ایک گھروندا بنا کر مورتی نصب کردی جس کی پوجا پاٹ بھی شروع کردی گئی، رام بھگت جب اپنی رام بھگتی کے سارے کاموں سے باطمینان فارغ ہوگئے تو مرکزی سرکار کے انتظام میں سرکاری سواریوں کے ذریعہ باعزت طور پر انھیں ان کے ٹھکانوں تک پہنچادیا گیا۔

مسلمانوں کے مذہبی ناموس پر یہ ایسا حملہ تھا جس کی کرب ناکی سے بے چین اور مضطرب ہوکر وہ چیخ اٹھے تو مظلوموں کی یہ بیتابانہ آہ بھی ہماری سیکولر حکومتوں کو گوارہ نہیں ہوئی جس کی سزا میں ہزاروں مسلمانوں کو خون کی موجوں اور آگ کی لہروں میں غرق کردیا گیا، آج وہ کون سی ریاست ہے جو مظلوم مسلمانوں کے خون سے لہولہان نہیں ہے، وہ کون سا شہر ہے جس کی فضا یتیموں کی گریہ وزاری، بیواؤں کے نالۂ وشیون اور غمزدہ ماؤں کی آہ سرد سے کربناک نہیں ہے، جمہوریت اور سیکولرزم کے دعویدار ملک اور ایک سیکولر پارٹی کی حکومت میں اس جماعت پر یہ انسانیت سوز مظالم جس نے ملک کی آزادی میں بے لوث قربانیاں دی ہیں کس قدر شرمناک بات ہے، آخر مسلمان اس ملک کی قربان گاہ پر کب تک بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہئے اے ارض وطن　　جو ترے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا　　کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

سب کچھ لٹ جانے کے بعد وزیر داخلہ ہند صاحب بیان دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انھیں مکمل انصاف ملے گا، وزیر اعظم نے بھی اعلان کیا کہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے گی، مگر اس اعلان پر ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ بمبئی میں مسلمانوں پر شیوسینا کے خونخوار درندے ٹوٹ پڑے، سیکڑوں مسلمان ان کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے، اربوں کھربوں کی ان کی املاک لوٹ لی گئیں یا نذرِ آتش کردی گئیں، شیوسینا کے یہ درندے عروس البلاد میں درندگی مچاتے گھومتے رہے اور ہماری حکومت دم سادھے بیٹھی رہی، جب مسلمانوں کا خون پیتے پیتے ان درندوں کا جی بھر گیا تب جاکر بہیمیت کا یہ رقص ختم ہوا، رہا بابری مسجد کی تعمیر کا مسئلہ، تو جو حکومت قدیم عمارت کی حفاظت نہ کرسکی اس سے جدید تعمیر کی توقع رکھنی خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

اس وقت تو حکومت تذبذب کا شکار ہے ایک طرف قانون وانصاف کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف ووٹ اور کرسیٔ اقتدار کا مسئلہ ہے، اس لئے گھبراہٹ میں کبھی آرڈی ننس کا سہارا لے

رہی ہے تو کبھی عدالت کی پناہ تلاش کرتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نینی سنٹرل جیل میں بغاوت کے مقدمہ میں اپنا جو تحریری بیان دیا تھا اس کے درج ذیل اقتباس کو تاریخ کے حوالہ کے بغیر پڑھئے، اس کی ایک ایک سطر میں حالات حاضرہ کی عکاسی نظر آئے گی، مولانا آزاد اپنے بیان کے ایک پیراگراف میں لکھتے ہیں:

''یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے ایک طرف وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر وتشدد کرے، دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائش قانون وعدالت کی آڑ بھی قائم رہے، یہ دونوں باتیں متضاد ہیں، ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی ودرماندگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے اس لئے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کرلیں گے، شریف آدمیوں نے سچ مچ آنکھیں بند کرلی ہیں لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں، فی الحقیقت ''لا'' اور ''آرڈر'' کا ایک ڈرامہ کھیلا جارہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔''

﴿۷﴾

بابری مسجد کی تاریخ کا یہ ساتواں مرحلہ بھی ۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو پورا ہوگیا۔ یعنی بابری مسجد، اور رام جنم استھان حق ملکیت کے مقدمہ کا فیصلہ ۶۰ برس کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر الہ آباد ہائی کورٹ کی ایک بنچ نے سنادیا۔ جس پر بی. جے. پی نے خوشی کا اور کانگریس نے اطمینان کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کے جنرل سکریٹری تو مدعی ہیں کہ اس مقدمہ کا اس سے بہتر فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس موقع پر محض اتفاق کہہ کر اس منکشف حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس تنازعہ میں جتنے بھی اہم موڑ آئے، یا بالفاظ واضح بابری مسجد پر جو سانحہ بھی گزرا، اور اس تعلق سے قانون وانصاف، حق وعدل کا جب جب خون ہوا وہ سب ملک کی سب سے بڑی اور سیکولرزم کا سب سے زیادہ دم بھرنے والی پارٹی کانگریس ہی کے دور اقتدار میں ہوا ہے۔

مسلمان ابتداء ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہمیں عدالت اور اس کے نظام قانون پر یقین واعتماد ہے، ملک کے ہر شہری کو ملک کی عدالت اور اس کے نظام قانون وانصاف پر اعتماد رکھنا ہی چاہئے، لیکن سنگھ پریوار ہمیشہ سے یہی کہتا رہا کہ یہ عقیدہ اور آستھا کا معاملہ ہے عدالت اس کے

بارے میں فیصلہ کی مجاز نہیں ہے، لہٰذا عدالت جو چاہے فیصلہ کرے جنم استھان مندر ہم جہاں چاہتے ہیں وہیں بنے گا، مگر عدالت کا فیصلہ آجانے کے بعد اس کا یہ سُر مدھم پڑ گیا ہے۔

رہا معاملہ کانگریس پارٹی کا تو بقول ''دی سنڈے گارجین کے ایڈیٹر، اور انڈیا ٹوڈے کے ایڈیٹوریل ڈائرکٹر اے، جے اکبر کے'' ''اس تنازع کے بارے میں کانگریس کی پالیسی کا ایک ہی محور رہا ہے، اور وہ ہے مسلم ووٹوں کو کھوئے بغیر مندر کی تعمیر کس طرح کی جائے''۔ (سہارا نئی دہلی ۳/اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اپنی اس پالیسی کے تحت اس نے ایک طرف تو اطمینان کی سانس لی، اور دوسری طرف مختلف ذرائع سے اس کوشش میں لگ گئی کہ مسلمان اس فیصلہ کو قبول کر کے اس تنازع کو ختم کر دیں، پھر اپنی اس سعی کو بظاہر لاحاصل دیکھ کر باہمی گفت وشنید اور مصالحت کا شوشہ چھوڑ دیا ہے۔ ''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔''

فیصلہ آنے سے پہلے ہی ملک کے وزیر داخلہ نے میڈیا کے ذریعہ یہ ہدایت جاری کر دی تھی کہ امن وسلامتی کی فضا کو بحال رکھنے کے لئے عدالت کے فیصلہ پر نقد وتبصرہ نہ کیا جائے، اور میڈیا کو بھی یہ حکم دیا تھا کہ فیصلہ سے متعلق جس قدر ہو سکے کم خبر دی جائے، چونکہ کوئی فیصلہ اسی وقت اطمینان بخش اور قابل قبول ہوتا ہے، جبکہ وہ قانون وانصاف اور حق وعدل کے معیار پر پورا اترتا ہو، اس لئے اس حکم زباں بندی کے باوجود، فیصلہ کے آتے ہی ملک کے دانشوروں، قانون دانوں، تاریخ کے ماہروں وغیرہ کا وہ طبقہ جو سیاست گزیدہ نہیں ہے بیک زبان پکار اٹھا کہ ملک کے نظام عدالت پر اعتماد کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ سیاسی دخل اندازیوں نے قانون وانصاف کے گھٹنے توڑ کر اسے آستھا اور عقیدت کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔

جبکہ بی. جے. پی کے انتہائی سینئر مقتدر لیڈر لال کرشن ایڈوانی اس فیصلہ کی حمایت کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ ''میری رائے میں یہ فیصلہ عقیدہ کو قانون سے بالاتر قرار نہیں دیتا بلکہ عقیدے کو قانونی جواز فراہم کرتا ہے''۔

آج ایڈوانی جی شوق سے اس فیصلہ کی حمایت میں نکتہ آفرینیاں کریں، لیکن انھیں اور ان کے ہم خیالوں کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ قانونی جواز سے لیس ہو کر کل کو جب یہ آستھا کا بھوت بوتل سے باہر نکلے گا تو پھر بدری ناتھ، پوری، ترویني، بندھاپور، امراوتی، تیر، جزولا، ایہول، انداولی، ایلورا سرنگیری وغیرہ کے مندروں کا کیا ہوگا؟ جو مؤرخین کی تحقیق اور بدھسٹ لاماؤں کے بقول، بودھ مت ویہاروں پر بزور قبضہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ (دیکھئے مہاراشٹر کے مشہور مؤرخ جمنا داس کی کتاب ''ترویني مندر بودھوں کی عبادت گاہ تھی)

علاوہ ازیں خود اجودھیا کے بہت سارے مندر بھی اس کے آسیب سے کیا خود کو بچا پائیں گے؟ کیونکہ چین کا بدھسٹ عالم اور سیاح ہیون شیانگ جو راجہ ہرش (مشہور بنام راجہ سلاوت) کے عہد ۶۳۰ء میں ہندوستان کی سیاحت پر آیا تھا اور تقریباً پندرہ سولہ سال یہاں رہ کر ملک کے چپہ چپہ کی سیر کی تھی، جس کی مکمل تفصیل اس نے اپنے سفرنامہ میں درج کی ہے، اس کا یہ سفرنامہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا انگریزی، اردو وغیرہ بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، وہ اپنے اس سفرنامہ میں قنوج کی سیاحت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے ''میں یہاں سے اجودھیا کے لئے روانہ ہوا'' یہاں پہنچ کر اس نے جو کچھ دیکھا اس کا ذکر یوں کرتا ہے ''یہاں (اجودھیا میں) ایک سو عبادت گاہیں (ویہار) اور کئی ہزار پجاری ہیں، میں نے اجودھیا میں بودھ مت کے قدامت پسند اور جدّت پسند دونوں فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا''

چینی سیاح کی یہ تحریر بتا رہی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں اجودھیا کے اندر بدھوں کے ایک سو ویہار تھے، لیکن جب بہار کے ایک عظیم برہمن رہنما کمارل اور ان کے بعد ان کے مشہور چیلہ شنکر اچاریہ نے (جن کا زمانہ آٹھویں صدی کا آخر اور نویں صدی کا اوّل متعین کیا جاتا ہے) بودھ مت کے برخلاف شیومت کی پرزور تحریک برپا کی تو بدھسٹ اس کا مقابلہ نہیں کر سکے، جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں پھیلے بدھوں کے بڑے بڑے ویہار اور قدیم عبادت گاہیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا انھیں شیومندر میں تبدیل کر لیا گیا، اسی دور میں اجودھیا کے یک صد ویہار بھی شیومندر بنا لئے گئے، پھر مشہور رہنما رامانند (پیدائش ۱۲۹۹ء) کی کوششوں سے جب شمالی ہندوستان میں شیومت کے مقابلہ میں وشنومت کو فروغ حاصل ہو گیا اور وشنو کے اوتار کی حیثیت سے ''رام جی'' کی پوجا عام ہو گئی تو ان شیومندروں کو رام مندر کا نام دیدیا گیا، تو کیا اب ملک کے ان مشہور مندروں کو آستھا کی چرنوں پر بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے؟ یہ کوئی سمجھ بوجھ کی بات نہیں ہے کہ آدمی ضد، دشمنی اور موہوم مفاد کے تحت عقل و ہوش سے بالکل عاری باتیں کرنے لگے، اس بات کو کون نہیں جانتا کہ متمدن دنیا آئین و قانون کی محتاج ہی اس لئے ہے کہ ایک ساتھ رہنے والوں کے درمیان جب خواہشات و جذبات، آستھاؤں اور عقیدتوں میں تنازع اور ٹکراؤ ہو تو اسے قانون و انصاف کے ذریعہ رفع دفع کیا جا سکے، لیکن جب قانون کے مقابلہ میں آستھا کو فوقیت دی جائے گی تو یہ تنازعہ لازمی طور پر ختم ہونے کی بجائے اور بڑھے گا تو کیا اس صورت میں ملک کی یکجہتی برقرار رہ پائے گی کیونکہ مہذب آدمی قانون و انصاف کے آگے سرنگوں ہوتا ہے نہ کہ فریق مخالف کی آستھاؤں کے سامنے چنانچہ مشہور کالم نگار صحافی سنتوش بھارتیہ لکھتے ہیں کہ

''اس فیصلے نے ایسے سوال کھڑے کئے ہیں جن کا حل نکلنا ضروری ہے، وگرنہ ملک میں ایک نئے فرقہ وارانہ دور کی شروعات ہوگی جماعتیں عقیدت کے نام پر مسجدوں، بودھ مٹھوں، اور جینیوں کے مندروں کے خلاف عدالت میں جائیں گی، اورالہ آباد کورٹ کے فیصلے کونظیر کے طور پر پیش کریں گی۔'' (راشٹریہ سہارا، ۲؍اکتوبر ۲۰۱۰ء)

پھر ہمارا ملک مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کا گہوارہ ہے، ہر تہذیب و مذہب کے پیروکاروں کی آستھائیں اور عقیدتیں الگ الگ ہیں لہٰذا سوال پیدا ہوگا کہ کس کی آستھا کو عدالتیں معیار بنائیں گی، اگر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے مطابق اکثریتی طبقہ کی آستھاؤں کو فیصلہ کا معیار بنایا جائے، تو اس صورت میں جمہوریت اور سیکولرزم سے ہاتھ دھونا پڑے گا، تو کیا ملک کی جمہوریت پر اس راست حملہ کو یہاں کے جمہوریت پسند، سیکولرنواز عوام خاموشی سے برداشت کرلیں گے؟

غرضیکہ اس فیصلہ نے ملک کو ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کردیا ہے، جس میں ایک تو حق وانصاف اور امن وسلامتی کی سمت جارہا ہے اور دوسرا جبر وناانصافی اور انتشار وخلفشار کی طرف، اب تک کے احوال سے یہی ظاہر ہورہا ہے کہ چند لوگوں کے علاوہ ملک کی اکثریت حق وانصاف اور امن وسلامتی کے راستہ ہی کو ترجیح دے رہی ہے اسی لئے ان چند افراد کے علاوہ سب کی زبان پر یہی ہے کہ ملک وقوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے، کیونکہ ملک آستھاؤں اور عقیدوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانون وانصاف ہی کے تحت چلے گا۔

علاوہ ازیں ہم اپنے دین ومذہب کی رو سے اس کے پابند ہیں کہ خدائے بصیر وقدیر کی جانب سے مقرر دینی شعائر کی عظمت وحرمت کے تحفظ وبقاء کی حسب استطاعت جدوجہد کرتے رہیں، لہٰذا آئین وقانون جب یہ موقع فراہم کررہے ہیں کہ ہم حق وانصاف کے حصول کے لئے ملک کی سب سے بڑی اور آخری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں، تو اس صورت میں ہمارے لئے روا نہیں ہوگا کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کو قبول کرکے برضاء ورغبت اپنے اس حق اور شرعی فریضہ سے دست بردار ہوجائیں، رہا معاملہ نتیجہ وانجام کا تو یہ ہمارے نہیں بلکہ مالک الملک اور رب العالمین کے قبضہ واختیار میں ہے، ہم تو اس کے بندے ہیں، ہماری بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ اندیشہ نفع وضرر سے بے نیاز ہوکر اس کے حکم کے آگے گردن جھکادیں۔

اگرچہ بت ہے زمانے کی آستینوں میں
ہمیں ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

عصر حاضر میں اسلامی قانون کی معنویت

از: اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف بستی پور، بہار

اسلامی قانون ایک انتہائی حساس موضوع ہے جس پر ہر دور کے بہترین دماغ خرچ ہوئے ہیں اور امت کے ذہین ترین لوگوں نے اس پر کام کیا ہے، دیگر علوم وفنون کی طرح اس کی فنی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے، لیکن اصل چیز جس نے ہر دور میں اس کو زندہ علم کے طور پر باقی رکھا ہے اور جس میں دنیا کا کوئی علم وفن اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا وہ ہے حالات زمانہ پر اس کی تطبیق کا مسئلہ، یہ محض ایک فن نہیں ہے جو تحقیق وریسرچ کی چہار دیواری میں محدود ہے بلکہ دنیا کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہے، احوال زمانہ پر اس کی نظر ہے، سوسائٹی کا نظم وضبط اس کے ذمہ ہے، نظام اخلاق کی باگ ڈور اس کے پاس ہے، احوال وظروف کی تشکیل میں اس کا بڑا حصہ ہے، اگر معاشرہ پر اسلامی قانون کی حکمرانی نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جائے گا، اسلامی قانون اخلاق اور انسان کی پرائیویٹ لائف سے بھی بحث کرتا ہے اور سیاسی اور سماجی نظام سے بھی، اسلامی قانون انسانی دنیا کے لئے خدا کا شاندار عطیہ ہے، انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اس کی ہمسری نہیں کرسکتا، جب تک دنیا پر اسلامی قانون کی حکمرانی قائم رہی دنیا میں امن وسکون اور خوشحالی وفارغ البالی بھی پورے طور پر باقی رہی، لیکن جب سے دنیا اس قانون کے سایہ سے محروم ہوئی ہے بدامنی، بدچلنی، غربت وبھوک مری عام ہوئی، محبت ورواداری نے دم توڑ دیا، انسانی قدریں پامال ہوئیں، سارا فلسفۂ اخلاق کتابوں کے اوراق تک محدود ہوکر رہ گیا، عام زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا، قانون کو بازیچہ اطفال بنادیا گیا، دنیا کے کہترین دماغوں نے بھی اس پر دماغی زور آزمائی شروع کردی، جو قانون کے تعلق سے خود مخلص نہیں تھے ان کو عوامی انتخابات کے ذریعہ قانون سازی کا اختیار دے دیا گیا اس طرح قانون کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا گیا، دنیا نے اسلامی قانون سے محرومی کیا گوارا کی، زندگی کی ساری نعمتوں سے محروم ہوگئی، آج دنیا کو پھر اسی قانون کی ضرورت ہے، آج دنیا جس امن وسکون کی متلاشی ہے وہ صرف اور صرف قانون اسلامی کی نگرانی ہی

میں حاصل کی جاسکتی ہے دنیا کے تمام تر قوانین اس کے سامنے بونے اور ادھورے ہیں سب نے اسلامی قانون سے خوشہ چینی کی ہے اور سینکڑوں برسوں سے ہزاروں دماغ اس کی ترتیب وتہذیب میں لگے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دور طفولیت سے بھی نہیں نکل سکے ہیں۔

آج دنیا کے سنجیدہ لوگ دوبارہ اسلامی قانون کے تعلق سے غور کرنا چاہتے ہیں، مگر کچھ ہمارے اپنوں کی نادانی اور کچھ غیروں کی عیاری کہ یہ بات صرف نظریہ وتفکیر کی حد تک رہ جاتی ہے کوئی عملی صورت نہیں بن پاتی، ان حالات میں ہمارے ذہین اور مخلص لوگوں کو اس موضوع پر کام کرنے کی سخت ضرورت ہے، ادھر چند دہائیوں سے اسلامی علوم پر کام کرنے والوں میں یہ رجحان بڑھا ہے اور اس سلسلے کی بعض کاوشیں بھی سامنے آئی ہیں، اس ضمن میں حقیر راقم الحروف کی بھی ایک کوشش دوسال قبل کتابی صورت میں سامنے آئی ہے، اس میں اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے بہت کچھ مواد مل سکتا ہے۔

ایک مکمل نظام حیات

اسلام ایک آفاقی مذہب اور مکمل نظام حیات کا نام ہے جس نے ہر دور میں انسانیت کی رہبری کی ہے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک روئے زمین کی سب سے مضبوط اور رقبہ کے لحاظ سے سب سے وسیع قیادت کی زمام کار اس کے ہاتھ میں رہی ہے اور اس پورے عرصے میں سینکڑوں انقلابات اور حالات کی گردشوں کے باوجود کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی کسی حلقے میں یہ احساس نہیں پایا گیا کہ اس قانونی نظام میں کسی قسم کی تنگی یا تشنگی پائی جاتی ہے اسلام کے قانونی نظام نے ہر دور میں انسانیت کے ہر طبقے کے مسائل کو حل کیا اور ملک وقوم کی ترقی واستحکام میں بنیادی رول ادا کیا۔

جب تک مسلمان شعوری طور پر اس نظام سے وابستہ رہے ان کی ترقی وتوسیع کا سلسلہ جاری رہا، وہ جہاں گئے ارض وفلک نے ان کا استقبال کیا لوگوں نے اپنی پلکیں بچھائیں اور دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اس لئے کہ وہ ایسا نظام حیات جاری کرنے گئے تھے جو امن وخوشحالی، ترقی واستحکام اور داخلی وخارجی سکون کا دائمی ضامن ہے۔

زوال کا سبب

لیکن جب مسلمانوں کا رشتہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نظام سے کمزور ہوا تو وہ بھی

اندرونی طور پر کمزور ہونے لگے اوران کی قومی واجتماعی زندگی پر زوال کی پرچھائیاں پڑنے لگیں اس لئے کہ اجتماعی زندگی کیلئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اور کسی بھی اجتماع کے ٹوٹنے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس نظام کو توڑ دیا جائے یا مشتبہ کردیا جائے جس سے وہ اجتماع جڑا ہوا ہے، کسی بھی قوم کا زوال اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے خواہ اس کا ادراک قوم کے بڑے طبقے کو ہو یا نہ ہو، مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، مسلمانوں نے جو خدائی قانون اور اسلامی نظام روئے زمین پر نافذ کیا تھا اس میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے تھے، اس نظام کی ترجیحات میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں کا تھا۔ دوسری اقوام اور اقلیتوں کو بھی تمام انسانی حقوق دیئے گئے تھے مگر فرق یہ تھا کہ اس میں مسلمانوں کی حیثیت دینے والوں کی اور دوسری اقوام کی لینے والوں کی تھی، لیکن جب اسلامی نظام کی جگہ دوسرا نظام آیا اور اجتماعیت دین سے کٹ کر غیر دینی نظام سے جڑ گئی تو اس نئے نظام میں تمام ترجیحات دوسروں کے لئے ہوگئیں اور اس کی اگلی صفوں میں ایسے لوگ براجمان ہوگئے جن کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی اس لئے اب مسلمانوں کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اگر اس موقعہ پر بھی مسلمانوں کی قومی غیرت اور دینی حس جاگ اٹھتی تو وہ اپنی غلطیوں کی تلافی کرسکتے تھے اور اس نئے مصنوعی نظام سے پیچھا چھڑا سکتے تھے مگر افسوس کہ مسلمانوں کے حکمراں طبقے کی غالب اکثریت ایسی مجرمانہ غفلت کی شکار رہی اور جھوٹی مصلحتوں اور عارضی لذتوں کے وہ ایسے دلدادہ رہے کہ ان کی ساری حس ہی مردہ ہوکر رہ گئی، بقول شاعر

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اور جب کوئی قوم اس درجہ بے حسی کا شکار ہوجاتی ہے تو زندگی کی ساری رعنائیاں اس سے رخصت ہوجاتی ہیں اور اس میں اور مردہ جسم میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔...قرآن حکیم نے اس قومی زوال اور اجتماعی بے حسی کو موت کا نام دیا ہے:

اموات غیر احیاء و ما یشعرون ایان یبعثون (النمل:۲۱)

ترجمہ: ''یہ زندوں کی آبادی نہیں بلکہ مردوں کی بستی ہے، جو اٹھنے اور اٹھائے جانے سے بے خبر پڑے ہیں''

آج ساری دنیا میں مسلمانوں کے عمومی زوال کا بڑا سبب یہ ہے کہ اپنے چشمہ حیات سے ان کا رشتہ کمزور ہوگیا ہے انھوں نے اس قانونی نظام کو سرد خانے میں ڈال دیا ہے، جو نہ صرف ان

کی زندگی وتشخص کوضمانت فراہم کرتا ہے بلکہ ساری انسانیت کی حیات وارتقا کا راز بھی اس میں پوشیدہ ہے، مسلمانوں کی مثال اس کائنات ارضی میں دل کی ہے دل سے صالح خون جاری ہوگا تو سارے عالم کا نظام درست رہے گا اور دل کا نظام کمزور ہوگا تو سارے عالم پر اس کا اثر پڑے گا۔ لیکن مسلمان اپنا یہ مقام بھول گئے ان کو اپنی حقیقت کا عرفان نہ رہا انھیں یاد نہ رہا کہ وہ کس خدائی منصب اور خدائی نظام کو لے کر اس انسانی دنیا میں آئے ہیں؟ انسانیت کتنی پیاسی ہے؟ قوموں کو ان کی کتنی ضرورت ہے؟ انھوں نے اپنے اوپر غفلت وخود فراموشی کی چادر تان لی اور اقوام عالم کو وادیٔ ظلمات میں جنگل کی بھیڑ کی طرح بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا، بلکہ وہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مادہ پرستی، دنیا طلبی، بدمستی وعیش کوشی کے میدان میں کود پڑے اور ابلیسی نظام یہی چاہتا تھا کہ دوسروں کو جگانے والی قوم خود سوجائے، بارخلافت اٹھانے والی جماعت خود تھک کر بیٹھ جائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سوتا خشک ہوکر رہ جائے۔

بقول ڈاکٹر اقبالؒ۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

کاش کوئی ایسی صورت پیدا ہوتی کہ مسلمان پھر اپنے گھر کی طرف پلٹیں، اپنا کھویا ہوا خزانہ واپس لیں، انھیں ایسی آنکھ نصیب ہو کہ وہ ہیرے موتی اور کنکر پتھر میں فرق کرسکیں اور وہ پوری بصیرت کے ساتھ جان سکیں کہ انسانوں کا بنایا ہوا مصنوعی نظام کبھی خالق کائنات کے عطا کردہ قانونی نظام کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا پھر یہ کیسی نادانی ہے؟ کہ خالق کا آستانہ چھوڑ کر دنیا مخلوق کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

اولئك يدعون الى النار والله يدعو الى الجنة (البقرة:۲۲۱)

ترجمہ: ''دنیا والے آگ کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ تمہیں جنت کی طرف پکار رہا ہے''

مگر اکثر لوگ رحمٰن کی پکار کے بجائے شیطان کے بلاوے پر کان دھر رہے ہیں۔ (قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز، ج:۱،ص:۵۵-۵۷)

اسلامی قانون کا مزاج

اس ضمن میں ہمیں اسلامی قانون کے مزاج کو اپنے پیش نظر رکھنا بہت مفید ہوگا اس طرح

اسلامی قانون کی افادیت اور اہمیت کو ہم اور اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں:

اسلامی قانون میں تمام اقوام عالم اور دنیا کے ہر خطے کی نفسیات اور طبعی میلانات کی رعایت رکھی گئی ہے، اسی مقصد کے پیش نظر اسلامی قانون کی تشکیل کے وقت چند بنیادی امور کا لحاظ کیا گیا جن سے اسلامی قانون کے ذوق ومزاج پر روشنی پڑتی ہے مثلاً:

❁ پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی ایسا حکم نہ دیا جائے جو عام لوگوں کیلئے ناقابل برداشت ہو۔

❁ عید اور تہوار منانے کی خواہش ہر قوم کے اندر موجود ہے اس جذبہ کی قدردانی کرتے ہوئے سال میں دو دن قومی عید کیلئے مقرر کئے گئے اور ان میں جائز اور مباح حد تک خوشی منانے اور زیب وزینت کرنے کی اجازت دی گئی۔

❁ عبادات میں طبعی رغبت ومیلان کو اہمیت دی گئی اور ان تمام محرکات وعوامل کی اجازت دی گئی جو اس میں معاون ومددگار ثابت ہوں بشرطیکہ ان میں کوئی قباحت نہ ہو۔

❁ جو چیزیں طبع سلیم پر گراں گذرتی ہیں ان کو ممنوع قرار دیا گیا۔

❁ تعلیم وتعلّم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو دائمی شکل دی گئی تاکہ انسانی طبائع کو اسلامی مزاج کے مطابق ڈھالنے میں مدد ملتی رہے۔

❁ بعض احکام کی ادائیگی میں عزیمت اور رخصت کے دو درجے مقرر کئے گئے تاکہ انسان اپنی سہولت کے مطابق جس کو چاہے اختیار کرے۔

❁ بعض احکام میں رسول اللہ ﷺ سے دو مختلف قسم کے عمل منقول ہیں اور حالات کے پیش نظر دونوں پر عمل کی گنجائش رکھی گئی۔

❁ بعض برائیوں میں مادی نفع سے محروم کرنے کا حکم دیا گیا۔

❁ احکام کے نفاذ میں تدریجی ارتقا کو ملحوظ رکھا گیا، یعنی ایک ہی وقت میں تمام احکام نافذ نہیں کردیئے گئے اور نہ ساری پابندیاں عائد کردی گئیں۔

❁ تعمیری اصلاحات میں قومی کردار کی پختگی اور خامی کی خاص رعایت رکھی گئی۔

❁ نیکی کے زیادہ تر اعمال کی مکمل تفصیل بیان کردی گئی اور اس کو انسانوں کی فہم پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ بڑی دشواری پیش آتی۔

❁ بعض احکام کے نفاذ میں حالات ومصالح کی رعایت کی گئی اور بعض میں اشخاص وافراد کی۔

قرآن وحدیث میں متعدد صراحتیں اور اشارات ایسے موجود ہیں جن سے مندرجہ بالا

اصولوں پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً:

فبما رحمة من اللّٰہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولك (آل عمران: ۱۷)

ترجمہ: ''اللہ ہی کی رحمت سے آپ ان کے لئے اتنے نرم دل ہیں، اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے چلے جاتے۔''

لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا (بقرة: ۲۸٦)

ترجمہ: ''اللہ کسی شخص کو اس کی قدرت وطاقت سے زیادہ مکلّف نہیں بناتا''

یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرة: ۱۸۵)

ترجمہ: ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے دشواری اور تنگی نہیں چاہتا۔''

وما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج:۷۸)

ترجمہ: ''اللہ نے دین کے معاملے میں تمہارے لئے کوئی تنگی نہیں رکھی''

ما یرید اللّٰہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم (المائدة:٦)

ترجمہ: ''اللہ نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی دشواری میں مبتلا کرے بلکہ اس کا مقصد تم کو پاک وصاف کرنا ہے۔''

رسول اکرم ﷺ نے حضرت موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو دینی معاملات کا انتظام سپرد کرتے وقت فرمایا:

یسرا ولا تعسرا ولا تنفرا تطاوعا ولا تختلفا (متفق علیه: مشکوٰة ۳۲۳ باب ما علیٰ الولاة من التیسیر)

ترجمہ: آسانی پیدا کرو، مشکل میں نہ ڈالو، رغبت دلاؤ، نفرت نہ دلاؤ، جذبۂ اتحاد واتفاق کو فروغ دو۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا:

بعثت بالحنفیة السمحة (رواہ احمد: مشکوٰة شریف: ۳۳٤ الجھاد)

ترجمہ: میں آسان دین حنیف دے کر بھیجا گیا ہوں۔

لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام (ابن ماجه: ۳٤۰ مستدرك حاکم ج۲ ص ۵۸،۵۷)

ترجمہ: اسلام میں نہ کسی کو تکلیف پہنچانا ہے اور نہ خود تکلیف اٹھانا ہے۔

مسواک کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواك عند كل صلوٰة (المشكوٰة: ٤٥ باب سنن الوضوء)

ترجمہ: اگر مجھے اسے بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میری امت مشقت میں پڑ جائے گی تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا وجوبی حکم دیتا۔

کعبہ میں ترمیم نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا:

لولا حدثان قومك بالكفر لهدمت الكعبة ثم لجعلت لها بابين (الحديث)

(مسدن احمد ص ١٨٩٦ حديث نمبر ٢٥٩٥٢)

ترجمہ: اگر میری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر اساس ابراہیمی پر اس کے دروازے بنا دیتا (اور حطیم کو اس میں شامل کرتا)

آپ کا عام دستور تھا کہ جب آپ کو دو چیزوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ اس میں آسان تر کو اختیار فرماتے بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہوتا۔

وما خير رسول الله ﷺ الا اختار أيسرهما مالم يكن اثماً . (متفق علیہ: مشکوٰۃ: ۵۹۱، مسند احمد بروایت حضرت عائشہ ص ۱۸۳۷ حدیث نمبر ۲۵۰۵۶)

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ دین میں تنگی نہ ہونے کا کیا مطلب ہے جب کہ ہم کو بدکاری، چوری اور دوسری بہت سی سفلی خواہشات کی چیزوں سے روک دیا گیا ہے، حضرت ابن عباس نے جواب دیا تنگی نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ سخت قسم کے احکام کا جو بوجھ بنی اسرائیل پر تھا وہ اس امت پر نہیں ہے۔ (کشاف ص ۲۹۲، تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۲۸)

ان آیات واحادیث سے اسلامی قانون کا مزاج سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے اور عام انسانی مفادات کیلئے اس میں کتنی گنجائش ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی قانون میں جو جامعیت، ابدیت، معنویت، زندگی، نفاست وحس اور ہر دور کے حالات پر اس کی تطبیقی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں ہے اسی لئے ہر زمان ومکان میں اسی کو قیادت کا حق بنتا ہے۔

اسلامی قانون کے اس امتیاز کو درج ذیل عنوانات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔

قانونی حیثیت

سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ انسانی قانون کی توثیق وتصدیق انسانی جماعت یا انسانی

عدالت کرتی ہے اس کے بغیر وہ قانون بن ہی نہیں سکتا، جبکہ اسلامی قانون کی تصدیق خود رب کائنات کرتا ہے، دنیا کی عدالت اس کو مانے یا نہ مانے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تقدیس کا پہلو

انسانی قانون اپنے لئے کوئی تقدیس کا پہلو نہیں رکھتا، یہ لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتا ہے دلوں پر نہیں، جبکہ اسلامی قانون اپنے ماننے والوں کے نزدیک ایک مقدس ومحترم قانون ہے، یہ انسانوں کے لئے خدا کا عطیہ ہے، اس طرح یہ جسموں کے ساتھ دلوں پر بھی حکومت کرتا ہے اور سوسائٹی کے ظاہر وباطن دونوں سے بحث کرتا ہے۔

مثبت ومنفی فرق

انسانی قانون کی تعمیر عموماً منفی بنیادوں پر ہوئی ہے، یہ اکثر ردعمل کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوتا ہے، اسی لئے افراد کی تعمیر، اخلاقیات، تزکیۂ نفس اور تطہیر وتربیت کے ابواب میں یہ کوئی رہنمائی نہیں کرتا، جبکہ اسلامی قانون زیادہ تر مثبت اصولوں پر چلتا ہے، اور اعمال سے زیادہ اسباب ومحرکات پر نگاہ رکھتا ہے اور اسی کی روشنی میں یہ قانون سازی کرتا ہے۔

قانونی معنویت

انسانی قانون کی بنیاد محض خاندانی رسوم وروایات اور علاقائی عرف وعادات پر ہے اس لئے اس میں تعصّبات وتنگ نظری کی تمام آلودگیاں موجود ہیں اس میں علمی اور فلسفیانہ بنیادوں کی آمیزش نہیں ہے، جبکہ اسلامی قانون کی بنیاد روز اوّل ہی سے انسانی فطرت اور ہدایت الٰہی پر ہے، یہ ابتدا ہی سے عالمگیر اور فلسفیانہ بنیادوں پر تعمیر ہوا ہے، انسانی قانون ہزاروں سال کے ارتقاء کے بعد جس منزل پر پہنچے گا اسلامی قانون کا پہلا قدم ہی وہاں سے اٹھا ہے۔

قانونی وحدت

قانون میں وحدت ویکسانیت بھی ایک ضروری چیز ہے انسانی قانون میں اصل کے لحاظ سے وحدت ویکسانیت موجود نہیں ہے اس لئے کہ اس کے سرمایے میں خاندانی روایات اور قومی عرف وعادات کا بڑا حصہ ہے جو ہر علاقہ اور خاندان کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں... جبکہ

اسلامی قانون شروع سے وحدت کے اصول پر قائم ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد رسم وروایات کے بجائے ہدایت الٰہی پر ہے، حضرت آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک تمام انبیاء کے قوانین ایک ہی وحدت کے ساتھ وابستہ ہیں، خود قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہٖ نوحاً والذی اوحینا الیك وما وصینا بہٖ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ أن أقیموا الدین ولا تفرقوا فیه (شوریٰ:۱۳)

ترجمہ: تمہارے لئے بھی اسی دین کو مشروع کیا ہے جس کی تعلیم نوح کو دی تھی اور اے پیغمبر! یہ بھی جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور یہی دین ہے جس کی تعلیم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دی تھی کہ اس دین کو قائم کریں اور اس میں اختلاف نہ کریں۔

سرچشمۂ قانون

اسی طرح انسانی قانون چند انسانی ذہنوں کی پیداوار ہے جبکہ اسلامی قانون خود خالق کائنات کا دیا ہوا عطیہ ہے اور آج اس حقیقت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ انسان کبھی خود اپنے لئے قانون مرتب نہیں کرسکتا، اس لئے کہ انسان محدود علم واحساس رکھتا ہے وہ کروڑوں انسانوں کی نفسیات کا قدر مشترک معلوم نہیں کرسکتا اور تمام لوگوں کے احساسات وطبائع کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون سازی ہرگز نہیں کرسکتا، قانون خواہ کتنے ہی اخلاص کے ساتھ بنایا جائے مگر اس میں طبعی میلانات اور ذاتی رجحانات کا اثر ناگزیر طور پر آئے گا...اس لئے قانون سازی کا حق صرف خالق کائنات کو ہے۔

قانون جماعت سے یا جماعت قانون سے؟

انسانی قانون اور اسلامی قانون کے درمیان ایک اصولی فرق یہ بھی ہے کہ انسانی قانون میں قانون جماعت سے مؤخر ہوتا ہے، سوسائٹی پہلے ہوتی ہے اور اس کی تنظیم کیلئے قانون بنایا جاتا ہے، قانون جماعت کو پیدا نہیں کرتا...

جبکہ اسلام میں قانون جماعت سے مقدم ہے جماعت کے وجود اور اس کے حالات پر قانون کا انحصار نہیں ہوتا بلکہ قانون پہلے بنتا ہے اس کے مطابق جماعت کی تعمیر ہوتی ہے، اگر حالات سازگار نہیں ہیں تو ان کی اصلاح کی جاتی ہے اور ان کو نفاذ قانون کے لائق بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر حالات کی بنا پر قانون نہیں بدلا جاسکتا۔

نفاذ کی قوت

انسانی قانون قوت نفاذ کے لحاظ سے بھی کمزور واقع ہوا ہے اسے اپنے افراد پر مکمل قابو نہیں ہوتا اور نہ تنہا قانون جرائم کے انسداد کے لئے کافی ہوتا ہے اس کو اپنے کسی بھی قانون کے عملی نفاذ کے لئے مضبوط مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے اس قانون میں مجرمین کے بچ نکلنے کے بہت سے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلامی قانون کا آغاز ہی فکر آخرت اور حلال وحرام کے احساس سے ہوتا ہے وہ انسانی ضمیر کی تربیت کرتا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کو قانون کیلئے تیار کرتا ہے، وہ اپنے ہر شہری کے دل ودماغ میں یہ احساس راسخ کرتا ہے کہ

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہٖ (متفق علیہ ریاض الصالحین للنواوی ج ا ص ۱۴۵)

ترجمہ: ''تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی متعلقہ ذمہ داری کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

انما انا بشر وانہٗ یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہٖ من بعض فاحسب انہٗ صدق فاقضی لہٗ بذٰلك فمن قضیت لہٗ بحق فانما ھی قطعة من النار فلیأخذھا او لیترکھا (متفق علیہ مشکوٰۃ باب الاقضیہ والشہادات: ۳۲۷)

ترجمہ: ''میں ایک انسان ہوں، میرے پاس مقدمات آتے ہیں، ممکن ہے کہ کوئی فریق اپنے مدمقابل سے زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کے ظاہری دلائل کی بنا پر اس کو سچ گمان کروں اور اس کے حق میں فیصلہ کردوں اس لئے اگر میں کسی بھائی کیلئے دوسرے مسلمان بھائی کے حق کا فیصلہ کردوں تو محض فیصلہ کی بنا پر وہ درست نہیں ہوجائے گا وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہوگا جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑ دے۔''

انسانی قانون نہ صرف یہ کہ نگرانی اور حق پرستی کی اس عظیم قوت سے محروم ہے بلکہ اس کا تصور بھی اس کے دامن خیال میں نہیں ہے۔

اسلامی قانون میں انسانی نفسیات کی رعایت

اسلامی قانون فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اس میں انسانی طبائع اور نفسیات کی پوری

رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے قرآن کی آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

فاقم وجهك للدين حنيفاً فطرة اللّٰه التى فطر الناس عليها لاتبديل لخلق اللّٰه ذٰلك الدين القيم ولكن اكثر الناس لايعلمون (الروم: ۳۰)

ترجمہ: ''پس پوری یکسوئی کے ساتھ اس دین کی طرف متوجہ ہوجاؤ جو اللہ کی اس فطرت کے عین مطابق ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''

انسانی قانون میں کبھی بھی تمام انسانی طبائع اور تقاضوں کی رعایت ممکن نہیں ہے اس کی بیشمار مثالیں موجود ہیں (تفصیل کے لئے مطالعہ کریں حقیر راقم الحروف کی کتاب ''قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز، ج ۱، ص ۲۵۱-۲۵۴)

اسلامی قانون میں انسانی مصالح کی رعایت

اسلامی قانون کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی مصالح کو قانونی اساس کا درجہ حاصل ہے انسانی مصالح سے مراد پانچ امور ہیں... جان ...دین...نسل...عقل...اور مال، ان پانچوں چیزوں کی حفاظت سے متعلق تمام چیزیں مصالح انسانی میں داخل ہیں، دین ودنیا کے معاملات کا مدار انہی پر ہے اور انہی کے ذریعہ فرد اور جماعت کے جملہ مسائل کی نگرانی ہوتی ہے، تفصیل کیلئے مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔

آج دنیا کو پھر اسی قانون کی ضرورت ہے

مذکورہ بالا وجوہات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ انسانی دنیا کی رہنمائی آج بھی اسلامی قانون ہی کے ذریعہ ممکن ہے، اسلام ایک مکمل دین اور مکمل قانون ہے یہ ساری انسانیت کیلئے ایک فطری قانون ہے...

صدیوں سے انسان قانون سازی کے میدان میں کوشش کررہا ہے اگرچے کہ اس میں الٰہی قوانین سے بڑی حد تک استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تک کوئی ایسا مکمل قانون وضع نہ کیا جاسکا جس کو ناقابل ترمیم قرار دیا جائے اور انسانی جذبات وافعال کا مکمل آئینہ دار اس کو کہا جاسکے... یہ صرف قانون اسلامی ہے جو اپنے کو کامل ومکمل بھی کہتا ہے اور ناقابل تنسیخ

بھی قرار دیتا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً

(مائدۃ:۳)

ترجمہ: ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا، تم پر اپنی نعمتیں تمام کردیں اور بحیثیت دین اسلام کو پسند کیا''

ونزلنا علیك الکتاب تبیاناً لکل شیء وھدیً ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین

(الاعراف:۵۲)

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا واضح بیان اور مسلمانوں کے لئے ہدایت ورحمت وبشارت موجود ہے۔''

قرآن ایسے اصول وکلیات سے بحث کرتا ہے جن پر ہر زمانہ اور ہر خطہ میں پیش آنے والی جزئیات کو منطبق کیا جاسکتا ہے اور ہر دور کے حالات وواقعات میں قرآنی نظائر وامثال سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، قرآن کا یہ دعویٰ واقعات وتجربات کی روشنی میں بالکل درست ہے۔

ولقد ضربنا للناس فی ھذا القرآن من کل مثل (زمر:۲۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر طرح کی مثالیں بیان کردی ہیں''

اور اس کا اعتراف اپنے الفاظ میں قانون کے مغربی ماہرین نے بھی کیا ہے کہ شریعت اسلامی میں زندگی کے تمام مسائل ومشکلات کے حل کی پوری صلاحیت موجود ہے، متعدد سیمیناروں میں ان ماہرین نے باقاعدہ یہ قرارداد منظور کی کہ شریعت اسلامی بھی قانون سازی کے عام مصادر میں سے ایک مصدر ہے، اس میں ارتقاء کی پوری صلاحیت موجود ہے اور یہ قرارداد قانون مقارن کی بین الاقوامی کانفرنس ۱۹۳۱ء منعقدہ لاہای) میں منظور ہوئی، پھر اس کی تجدید اسی شہر میں ہونے والی دوسری کانفرنس (۱۹۳۷ء) میں ہوئی، نیز اسی طرح کی ایک قرارداد وکلاء کی بین الاقوامی کانفرنس (منعقدہ لاہای ۱۹۴۸ء) میں بھی منظور ہوئی۔

حقوق مقارنہ کی بین الاقوامی اکیڈمی کے شعبۂ شرقیہ نے ۱۹۵۱ء میں پیرس یونیورسٹی کے کلیۃ الحقوق میں ''ہفتۂ فقہ اسلامی'' کے نام سے ایک کانفرنس منعقد کی، اس میں حقوق کے تمام کالجوں کے عرب وغیر عرب اساتذہ، ازہر کی کلیات کے اساتذہ اور فرانس اور دیگر ممالک میں وکالت اور استشراق سے وابستہ متعدد ماہرین کو دعوت دی گئی، اس میں مصر سے ازہر اور حقوق کی

کلیات کے چار ارکان نے اور سوریا کے کلیۃ الحقوق سے دو ارکان نے نمائندگی کی... مناقشات کے دوران ان کے بعض ارکان جو سابق میں پیرس میں وکالت کے نقیب رہ چکے تھے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور کہا کہ:

''میں حیران ہوں کہ کیسے تطبیق دوں اس کہانی کے درمیان جواب تک سنی جاتی تھی اور آج کے اس انکشاف کے درمیان، ایک زمانہ تک یہ باور کرایا گیا کہ اسلامی فقہ ایک جامد اور غیر ترقی پذیر قانون ہے اس میں قانون سازی کی اساس بننے اور عصر جدید کی ترقی یافتہ تغیر پذیر دنیا کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جبکہ آج کے محاضرات ومناقشات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کے تعلق سے یہ مفروضہ بالکل بے بنیاد ہے اور دلائل وبراہین اس کے خلاف ہیں۔

چنانچہ ہفتہ فقہ اسلامی کے اختتام پر اس کانفرنس نے درج ذیل تجاویز منظور کیں:

❁ حقوق کے بارے میں قانون سازی کے نقطۂ نظر سے فقہ اسلامی کے سرچشموں کی بڑی اہمیت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

❁ حقوق کے اس عظیم مجموعے میں مذاہب فقہیہ کا اختلاف دراصل معانی ومفاہیم اور اصول وکلیات کا بڑا سرمایہ ہے جو مقام حیرت ومسرت ہے اور جن کی وجہ سے فقہ اسلامی زندگی کے تمام تر جدید تقاضوں اور قانونی ضروریات کی تکمیل کرسکتی ہے۔ (قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز ج۱ ص۲۷۲-۲۷۴)

ان سیمیناروں نے عرب کے ماہرین قانون کو موجودہ قوانین پر نظر ثانی کی دعوت دی اور ان کے ذہنوں کو اس جانب متوجہ کیا کہ شریعت اسلامیہ ایک ترقی پذیر اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مسائل وجزئیات کی تطبیق دینے والی ابدی شریعت ہے اور جو لوگ دنیا کو شریعت اسلامی کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں اور احکام اسلامی کے علاوہ کسی قانون کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، ان کا دعویٰ درست ہے۔

ان سیمیناروں اور کانفرنس کے بڑے خوشگوار اثرات قانونی دنیا پر پڑے اور پوری دنیا قانونی رہنمائی کے لئے شریعت اسلامی کی طرف متوجہ ہوگئی مثلاً منحرف مصر نے اپنا جدید قانون تمدن تیار کیا تو اسلامی قانون کو ایک بڑے مآخذ کی حیثیت سے سامنے رکھا اور اس سے خاصا استفادہ کیا، مصر نے اسلامی فقہ کو عام سرکاری مآخذ میں سے ایک مآخذ تسلیم کیا ہے (تفصیل کے

لئے دیکھئے ڈاکٹر احمد فراج حسین کی کتاب ''تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۱۸)

اس کے بعد متحدہ عرب جمہوریات نے جب اپنا دستور مرتب کیا تو اس میں شریعت اسلامیہ کو تشریعی اساس قرار دیا۔

اسی طرح مصر کی حکومت نے جب دوبارہ اپنے دستور کی ترتیب کا کام انجام دیا تو اس نے ہر قانون میں اسلامی احکام کے التزام کی ہدایت دی اور اس کو دستور کا لازمی جزو قرار دیا۔

اگر یونیورسٹیوں میں تحقیق وریسرچ کے شعبہ میں اسلامی قانون کو مطالعہ کا خاص موضوع بنایا جائے تو وہ دن دور نہیں کہ دنیا کے تمام قوانین اس کے سامنے سرنگوں ہوجائیں گے۔

چنانچہ عربی یونیورسٹیوں کے اتحاد نے متعلقہ تمام کالجوں کے ذمہ داروں کو اس کیلئے دعوت دی تاکہ مذکورہ احساسات کو عملی شکل دی جاسکے...اس سلسلے میں مورخہ ۲۴، ۳۰/اپریل ۱۹۷۳ء کو بیروت یونیورسٹی میں پہلی کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس نے یہ اپیل کی کہ بلاد عرب کی تمام کلیات الحقوق میں شریعت اسلامیہ کو قانون کے سرکاری مآخذ کی حیثیت سے تحقیق ودراست کا موضوع بنایا جائے۔

دوسری کانفرنس مارچ ۱۹۷۴ء میں بغداد یونیورسٹی میں ہوئی اس میں اس کے مختلف پہلوؤں پر مناقشہ کیا گیا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد بعض سفارشات منظور ہئیں ان میں اہم ترین حصہ وہ ہے جو ملک کے دستوری حقوق کی روشنی میں شریعت اسلامیہ کو قانون سازی کا مرکزی مآخذ بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ کریں ڈاکٹر فراج حسین کی کتاب تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۱۹-۲۰)

اس طرح کی کوششیں چھوٹی بڑی سطح پر بار بار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی قانون کے تعلق سے غلط فہمیاں دور ہوں اور دنیا پھر اسلامی قانون سے استفادہ کے قابل ہوسکے۔

❁ ❁ ❁

قربانی کے سلسلے میں امت کا تعامل
حقائق، مسلّمات اور غلط فہمیاں
(۱)

از: مفتی رشید احمد فریدی
مدرسہ مفتاح العلوم تراج، سورت، گجرات

(۱) تعامل امت اصول کی روشنی میں

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

اہل علم اور عوام وخواص سب بخوبی واقف ہیں کہ ایک جگہ کی قربانی دوسری جگہ یعنی شہر کی قربانی دیہات میں اور دیہات کی قربانی شہر میں اور ایک شہر کی قربانی دوسرے شہر میں کرنے کرانے کا سلسلہ خیر القرون سے چلا آرہا ہے۔ اس کے کلی وجزوی ضوابط وشرائط بھی ائمہ مجتہدین اور فقہاء رحمہم اللہ نے واضح لفظوں میں بیان کیا ہے جو کتب فقہ میں صراحتاً منقول ہیں۔

قربانی کے وجوب اور ادا، سے متعلق اصول وشرائط کا حاصل آسان لفظوں میں صرف اتنا ہے کہ مطلق قربانی کے صحیح ہونے کے لئے ایام نحر کا ہونا ضروری ہے اور یوم النحر ''دسویں ذی الحجہ'' کو شہر میں قربانی کیلئے مزید یہ شرط ہے کہ عیدالاضحیٰ کی نماز ہوچکی ہو۔ خواہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں ہو اور جس کی طرف سے قربانی ہے اگر وہ واجب قربانی کرنا یا کرانا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ شخص شرعاً غنی یعنی مالک نصابِ فاضل ہو اس لئے کہ مالی عبادت کے لئے قدرت بالمال یعنی شرعی غنا ویسار ضروری ہے اور یہ غنا قربانی کے وجوب کے سلسلہ میں شرط فی معنی العلۃ ہے۔ أن لا نزاع لأحد أن علة وجوب الأضحية على الموسر هى القدرة على النصاب. (تكلمة فتح القدير ج۹ ص ۵۰۷) وشرط اليسار لقوله عليه السلام من وجد سعة ولم يضح فلا يقربن مصلانا يدل على الوجوب بالسعة ولا سعة للفقير (بنايه) پس اگر کوئی شخص (عاقل، بالغ، مسلمان) غنی بن گیا تو شرعاً اس کے ذمہ صدقۂ فطر کی طرح قربانی کا بھی وجوب متعلق ہوجاتا ہے۔ اس میں کسی فقیہہ کا اختلاف نہیں ہے۔ یعنی مالک نصاب اس لائق ہوجاتا ہے

کہ اس سے صدقۃ الفطر اور قربانی کا مطالبہ کیا جائے اور جب وہ اس قابل ہے تو پھر اس کیلئے صدقہ لینا حرام ہے۔ ویتعلق بهذا اليسار احكام ثلثة حرمة اخذ الصدقة و وجوب زكوٰة الفطر والاضحية (مبسوط،ص:۳/۱۰۳) ونصاب تجب به احكام اربعة حرمة الصدقة، و وجوب الاضحية وصدقة الفطر، ونفقة الاقارب ولا يشترط فيه النمو بالتجارة ولا حولان الحول. (طحاوی وکذا فی العنایۃ) مالک نصاب کیلئے اخذ صدقہ کا حرام ہونا دلیل ہے کہ وجوب فی الذمہ متحقق ہو چکا ہے اور مطالبہ کی یہی لیاقت اور اہلیت کو مشائخ احناف کے نزدیک نفس وجوب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور جس طرح غنیٰ کی وجہ سے وجوب فی الذمہ ہوتا ہے اسی طرح نذر کی وجہ سے بھی ہوتا ہے اور نذر میں فقیر اور غنی دونوں برابر ہیں اور غنا و نذر کا حدوث و تحقق ایام نحر کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ والوجوب بسبب النذر يستوى فيه الفقير والغنى وان كان الواجب يتعلق بالمال. (بدائع) ولو قال ذلك (اى نذران يضحى بشاة وهو موسر) قبل ايام النحر يلزمه التضحية بشاتين بلا خلاف... ولو قال ذلك وهو معسر ثم ايسر فى ايام النحر فعليه ان يضحى بشاتين (بدائع ج۵ ص ۶۳) تو وجوب فی الذمہ یعنی نفس وجوب غنا یا نذر کی وجہ سے ایام نحر سے پہلے متحقق ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے نور السنی لمن یجب علیہ الاضحیۃ بالغنی)

اور فعل مامور بہ جس کو اپنے مقررہ وقت میں انجام دیا جائے تو اسے ''ادا'' کہتے ہیں۔ اس کا مطالبہ خطاب الٰہی سے جس پر صیغۂ امر دال ہے وقت مخصوص میں ہوتا ہے۔ فقہی تعبیر میں یہی ہے وجوبِ ادا، جو وقت سے قبل نہیں ہوتا اور وقت اسی خطاب الٰہی مخفی کا جو وجوب ادا کا حقیقی سبب ہے قائم مقام ہے اور وقت کے اندر فعل (مامور بہ) کو قضا نہ کہا جائے اس لئے یہ وجوب (مطالبہ) ادا سے متصل مانا گیا ہے۔ پس یہ وقت مخصوص خطابِ الٰہی کی معرفت کا نشان اور سبب وجوب ادا ہے۔

لہٰذا واجب قربانی وقت کے اندر جب بھی ذبح کی جائے ادا کہلائے گی اور ادا یعنی ذبح سے متصل وقت کے جزء مقدم کو سبب وجوب قرار دیا گیا ہے۔ (جیسا کہ نماز میں) خواہ ذبح کرنے والا اصیل یعنی وہی شخص ہو جس کے ذمہ قربانی کا وجوب ہوا ہے یا وکیل ہو اس لئے کہ مالی عبادت میں شریعت نے نیابت کو درست قرار دیا ہے پس وکیل کا اپنے وقت کے اعتبار سے قربانی کرنا شرعاً ایسا ہی ہے جیسا کہ خود مؤکل کا وکیل کے مقام میں قربانی کرنا۔ گویا مطالبۂ شارع نیابۃً وکیل کی جانب متوجہ ہے۔ جیسے مستطیع معذور کی طرف سے حج کرنے والا ارکان و واجبات کی

ادائیگی میں مقاماتِ ادار کے اوقات کی رعایت کرتا ہے اور شرعاً اسی کا اعتبار ہے نہ کہ مجوج عنہ کے وقت کا۔

نیز اہلیت وجوب سے مقصود بالذات چونکہ ادار ہے یعنی قربت وعبادت کو اپنے وقت میں انجام دینا اس لئے اس کا مطالبہ یعنی وجوب ادار بھی مقصود ہے اور محققین ماوراء النہر صرف اسی ایک ادار کے وجوب کو مانتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل اہلیت ادار کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اہلیت وجوب وادار کیلئے شرائط وجوب وادار کا ہونا ضروری ہے۔ قال اهل التحقيق من مشائخنا بما وراء النهر ان الوجوب فی الحقيقة نوع واحد وهو وجوب الاداء فكل من كان اهل الاداء كان من اهل الوجوب ومن لا فلا... لأن الوجوب المعقول هو وجوب الفعل كوجوب الصوم والصلوٰة وسائر العبادات. (بدائع ج۲ ص ۸۸) البتہ مشائخ احناف وجوبِ ادار کے قبل جس شئ کو تسلیم کرتے ہیں اس کو اصل وجوب یا نفس وجوب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو وجوب ادار سے مقدم اور منفصل عن الادار ہوتا ہے۔

یہ اہلیت یا نفس وجوب جن امور پر موقوف ہے۔ یعنی اسلام، عقل، بلوغ اور غناء واستطاعت وغیرہ دیکھئے وہ سب بندہ کی صفات ہیں پھر ان میں سے بعض کو فقہاء نے واجبات کے تحقق کیلئے شرط اور بعض کو سبب قرار دیا۔ نیز کسی صفت کو ایک جگہ شرط اور دوسری جگہ سبب اور کسی صفت کو ایک اعتبار سے شرط دوسرے اعتبار سے سبب کہا گیا ہے۔ بہرحال ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے کا مدار فقط کسی چیز کو سبب کہے جانے پر نہیں ہے۔ بلکہ وصف علت پر ہے کہ علت مُوجِب ہوتی ہے۔ البتہ ادا کے وجوب کا تعدد وتکرار اور عدم تکرار کی معرفت یقیناً صرف سبب کے لفظ سے وابستہ ہے۔ اسی لئے واجبات کی نسبت سبب کی طرف ہوتی ہے اور فقہاء نے نصوص کی روشنی میں جس چیز کو سبب وجوب قرار دیا ہے اس میں تکرار وعدم تکرار کا معنی مرعی ہوتا ہے خواہ وہ شئ وصف ہو یا وقت یا اس کے علاوہ۔

اب آپ دیکھئے کہ جس چیز کو مشائخ اصل وجوب سے تعبیر کررہے ہیں وہ وہی ہے جس کو اہلیت وجوب سے ذکر کیا گیا ہے کہ عقل وبلوغ وغیرہ کے پائے جانے پر ہی ذمہ مشغول بالواجب ہوگا اور ادار کی اہلیت پیدا ہوگی۔ مگر مطالبہ فعل (یعنی ادار) تو وقت کی آمد کے بعد ہی ہوگا۔ اور اسی کو وجوب ادار کہتے ہیں۔ پس وجوب ادار کا وقت (مخصوص) میں ہونا تمام فقہاء کے نزدیک قطعی ہے اور سببیت وقت سے متعلق فقہاء کا سارا کلام اسی وجوب متصل بالادار ہی کے محور پر گردش کرتا ہے۔ مثلاً الاعصر يومه عند الغروب لان السبب هو الجزؤ القائم من الوقت لانه لو

تعلق بالکل لوجب الاداء بعده ولو تعلق بالجزء الماضی فالمودی فی آخر الوقت قاضٍ واذا کان کذلك فقد اداها کما وجبت (ہدایہ ص ۱/۸۵) دیکھئے رسالہ دارالعلوم شمارہ شوال ۱۴۲۹ھ میں ''وجوب ادا، وقت معین کے ساتھ خاص ہے'' ص ۳۷۔ غرض یہ کہ وجوب ادا کا وقت مخصوص میں ہونا اصولاً وفقہاً بالکل مسلّم ہے خواہ ادا بھی موقت ہو جیسے نماز روزۃ کے اوقات یا وجوب تو وقت معین میں ہوا اور ادا موقت نہ ہو جیسے زکوٰۃ وصدقۃ الفطر۔

ذمہ مشغول بالواجب ہونے کے بعد وقتِ وجوب ادا، سے پہلے مالی عبادت زکوٰۃ وصدقہ الفطر میں ادائیگی درست ہے۔ یعنی مالک نصاب ہونے کے بعد حولان حول سے قبل زکوٰۃ اور صبح یوم الفطر سے قبل صدقہ ادا کرنا جائز ہے۔ اور قربانی میں مالی عبادت ہونے کی وجہ سے اصلاً ''تصدق'' کا وجوب ہوتا ہے۔ اور تصدق بالمال موقت نہیں ہے مگر ادا، بشکل اراقۃ الدم غیر معقولۃ المعنی ہونے کی وجہ سے نماز، روزہ کی طرح موقّت ہے۔ لہٰذا نفس وجوب ہونے کے بعد جب تک ادا، کا وقت نہ ہوا ادا، صحیح نہیں ہے اور صحت ادا، کے لئے شرائط وجوب کے علاوہ شرطِ ادا کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اور ذبح اضحیہ کی ایک شرط طلوع صبح یوم النحر سے لے کر بارہویں کے غروب آفتاب تک وقت کا ہونا ہے۔ یہ شرط شہر وغیر شہر قریہ، دیہات اور بیابان سب جگہ کے لئے عام ہے۔ اور دوسری شرط خاص ہے ذبح فی المصر کے لئے عیدالاضحیٰ کے دن نماز عید سے فارغ ہو جانا۔ یعنی شہر کیلئے دو شرطیں ہوئیں اور دیہات کیلئے فقط ایک۔ پس اگر کسی دیہات کے باشندہ نے اپنا اضحیہ خواہ وہ اس پر شرعاً واجب ہو یا نفل ذبح کیلئے شہر بھیج دیا اور وکیل نے نماز عید سے پہلے ذبح کر دیا تو باوجود صبح یوم النحر ہو جانے کے قربانی بالاتفاق ادا، نہیں ہوگی گویا شہر میں عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کا وقت نماز عید کے بعد شروع ہوتا ہے اور اگر شہری نے دیہات میں اپنا جانور بھیج دیا اور وکیل نے دیہات میں صبح صادق کے فوراً بعد ذبح کیا تو بالاتفاق قربانی ادا ہو جائے گی۔ حالانکہ من علیہ الاضحیہ شہری کے اعتبار سے ابھی وقت جائز نہیں ہوا ہے۔ (دیکھئے کشف الغطاء عن اعتبار الوقت لمحل الاداء، دارالعلوم شمارہ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ ص ۱۰۱)

اس سے معلوم ہو گیا کہ جہاں عبادت یعنی قربانی کی جارہی ہے وہیں کے وقت کا اعتبار کیا جائے گا نہ کہ اس شخص کے وقت کا جس کی طرف سے وہ قربت انجام دی جارہی ہے۔ اس کو اصول فقہاء نے یوں بیان کئے ہیں القربات الموقتة يعتبر وقتها فی حق فاعلها لا فی حق المفعول عنه اسی کی ایک نوع "المعتبر مكان الاضحيه" ہے۔ یہ بھی اصل کلی ہے اور حيلة

المصری اذا اراد التعجیل الخ اسی پر متفرع ایک جزئی ہے۔

یہ اصول وکلیات جس طرح عام اور متفق علیہ ہیں اسی طرح اس کے مطابق امت کا عمل تسلسل کے ساتھ ۱۴؍ چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ یہاں تک کہ شعبان ۱۴۲۰ھ میں مولانا مفتی عصمت اللہ صاحب زید مجدہ دارالعلوم کراچی نے ایک جگہ کی قربانی دوسری جگہ کرنے پر ایک استفتاء کا جواب لکھا جس کا پہلا جملہ یہ ہے۔ "الجواب حامدًا ومصلیاً قربانی کے نفس وجوب کا سبب وقت ہے جو کہ یوم النحر کے طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارہویں تاریخ کے غروب آفتاب تک ہے۔" یعنی وقت خاص (ایام نحر) کو جو کہ وجوب ادا کا سبب ہے نفس وجوب کا سبب قرار دیا۔ یہاں سے نقطۂ اختلاف رونما ہوا اور نتیجہ تواتر اور تعامل کے خلاف برآمد ہوتا چلا گیا۔

(۲) مفتی اعظم گجرات مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کا فتویٰ

فقیہہ النفس امیر شریعت گجرات مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ سے وفات سے کئی سال پہلے قمری تاریخ کے اختلاف کے نتیجہ میں ایک علاقہ کی قربانی دوسرے علاقے میں کرنے سے متعلق استفتاء کیا گیا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب مرحمت فرمایا۔ ملاحظہ ہو۔

❁ ذبح قربانی میں قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس کا اعتبار ہوتا ہے

سوال: (۲۵۲۳) بھائی عبدالرشید نے مدراس سے یہاں حیدرآباد میں قربانی کرنے کو لکھا ہے۔ وہاں عید پیر کو ہے اور یہاں اتوار کو۔ ان کی قربانی ہم یہاں اتوار کو کرسکتے ہیں یا نہیں؟ یا پیر کو کرنا ہوگی؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب:

قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس جگہ کا اعتبار ہوتا ہے۔ قربانی کرانے والے کی جگہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر قربانی والا شہر میں ہو اور وہ اپنا قربانی کا جانور ایسے گاؤں میں بھیج دے جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی اور وہاں صبح صادق کے بعد اس کی قربانی کا جانور ذبح کردیا جائے تو اس شہر والے کی قربانی صحیح ہوجائے گی۔ ہدایہ آخرین میں ہے۔ والمعتبر فی ذلك مكان الاضحيه حتى لو كانت فى السواد والمضحى فى المصر يجوز كما انشق الفجر ولو كان على العكس لايجوز الا بعد الصلاة وحيلة المصرى اذا اراد التعجيل ان يبعث بها

الی خارج المصر فیضحی بها کما طلع الفجر الخ (ہدایہ آخرین ص۴۳۰)

درمختار میں ہے۔ والمعتبر مکان الاضحیة لا مکان من علیه فحیلة المصری اذا اراد التعجیل ان یخرجها لخارج المصر فیضحی بها اذا طلع الفجر (مجتبیٰ، درمختار)

قولہ "والمعتبر مکان الاضحیه" الخ فلو کانت فی السواد والمضحی فی المصر جازت قبل الصلاة وفی العکس لم تجز. (قہستانی، درمختار وشامی ص۵/۲۷۸ کتاب الاضحیہ)

ذرا یہ بھی گوشۂ خیال میں رکھئے۔

حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ کے ''فتاویٰ رحیمیہ'' میں قربانی کے سلسلہ میں مذکورہ بالا فتویٰ نویں جلد میں مرقوم ہے یہ اور دوسرے فتاویٰ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ العالی خلیفہ حضرت فقیہہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی غائر نظر ثانی اور محقق عصر حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب دامت برکاتہم محشی امداد الفتاویٰ کی توجہ اور تصحیح کے مشکل ترین مرحلہ سے گذر کر صاحب فتاویٰ کی زندگی میں وفات سے کافی عرصہ قبل زیور طباعت سے آراستہ ہوکر مقبولِ خواص وعوام ہوگئے تھے۔

ان فتاویٰ کے بارے میں مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہ کا یہ وقیع جملہ ذہن نشیں رہے ''مجھے اس بات کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ فتاویٰ رحیمیہ کا ہر فتویٰ تسلی بخش اور پیاس بجھانے والا ہے۔''

قربانی کا مذکورہ فتویٰ اگر واقعتاً فقہ واصول فقہ کے خلاف ہوتا (جیسا کہ تسامح قرار دینے والوں کا خیال ہے) تو ترتیب ونظر ثانی وثالث کے وقت حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ العالی قطعاً اسے بغیر نقد کے نہ چھوڑتے اور حضرت مفتی سعید صاحب مدظلہ جیسے باریک بیں شخص سے ہرگز یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ خلافِ اصول فتویٰ کو بغیر اصلاح کے روا رکھیں۔ اس لئے یہ کہنے میں ذرا بھی تردد نہیں ہے کہ مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ کا فتویٰ متواتر اصول اور متوارث عمل کے بالکل مطابق ہے جیسا کہ اب بھی اہل علم کے نزدیک یہی معلوم ومعہود ہے۔

(۳) از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

شریعت محمدی جس کے عناصر اربعہ قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس ہیں اس کے تحفظ کا نقطۂ فکر موجودہ دور میں برصغیر میں دارالعلوم دیوبند مانا جاتا ہے۔ جس کا مزاج حدیث وفقہ اور احسان وکلام کے اخلاط اربعہ سے مرکب ہے۔ فقہ میں بالخصوص احناف کا ترجمان اور سلف وخلف

کے طریق مستقیم اور تعامل کی راہِ معتدل پر قائم ہے۔

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے طرف سے ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ کے آخر میں حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مدظلہ العالی نے قربانی کے اسی موضوع کے متعلق جو فتویٰ تحریر فرمایا ہے اور اس پر حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مدظلہ وغیرہ نے دستخط فرمائے ہیں۔ وہ پیش خدمت ہے۔

تنبیہ: احقر نے ماہِ شعبان میں تعطیل سے پہلے براہِ راست حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مدظلہ سے دارالعلوم دیوبند میں ملاقات کی۔ خیریت ومزاج پُرسی کے بعد راقم نے عرض کیا کہ حضرت والا نے قربانی سے متعلق جو فتویٰ لکھا ہے وہ اصول کے بالکل مطابق اور صحیح ہے اور مفتی شبیر صاحب مرادآبادی کا فتویٰ اصول کے خلاف جارہا ہے اس لئے میں آپ کے فتویٰ کو شائع کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ نے بخوشی اجازت مرحمت فرمائی۔ فجزاهم الله احسن الجزاء.

السلام علیکم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

سوال: باہر ممالک سے قربانی کے لئے ہندوستان میں اپنے رشتہ دار اور اعزاء واقارب کے یہاں عیدالاضحیٰ کے موقع پر افریقہ، لندن، امریکہ، فرانس وغیرہ سے کاغذ اور فون کے ذریعہ کہتے ہیں کہ بکریوں یا سات حصہ والے جانوروں کی قربانی کرنا، تو اُن لوگوں کی طرف سے ہم لوگ یہاں جس دن عیدالاضحیٰ ہوتی ہے اس دن عید کی نماز کے بعد بکریوں یا سات حصہ والے جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ دس، گیارہ، بارہ تین دن۔ تو شریعت کے اعتبار سے یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اس کا تفصیلی جواب مع حوالۂ کتب دیجئے۔

دوسرے ملک والے ہندوستان والوں کو قربانی کرنے کیلئے وکیل بناتے ہیں۔ تو اب قربانی کرنے میں وکیل کے ایام قربانی کا اعتبار ہوگا یا جن حضرات کی قربانی ہیں ان کے ایام قربانی کا اعتبار ہوگا۔

فقط والسلام۔ اسماعیل یوسف داؤدجی

۱۴۲۵/۱۲/۲۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب: هو الموفق قربانی جہاں کی جاتی ہے اس کا اعتبار ہوتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں قربانی ہوگی تو اسی ملک کی تاریخ ۱۰/۱۱/۱۲ ذی الحجہ کا اعتبار ہوگا۔ اور انہی تاریخوں میں قربانی کی جائے گی۔ افریقہ، لندن وغیرہ ملکوں کا اعتبار نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی محمد ظفیر الدین غفرلہ
مفتی، دارالعلوم دیوبند

جن اصول کے تحت امت کا تعامل چلا آرہا ہے اور کتب فقہ میں صراحتاً مذکور ہے اُسی اصل وضابطہ کو حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب کے سابق فتویٰ اور مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کے لاحق جواب میں بطور دلیل ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں فتاویٰ اصول فقہیہ وشرعیہ اور سلف وخلف کے صحیح موقف کے بالکل مطابق ہیں۔

(۴) مباحثِ فقہیہ کی پذیرائی

قربانی کے مسئلہ میں اختلاف ۱۴۲۵ھ کے اواخر میں جب بڑھ گیا اور بتوفیق الٰہی غور وفکر کے بعد تفتیش وتحقیق میں قدم رکھا گیا تو بفضلہٖ تعالیٰ امت کا چودہ سوسالہ تعامل بدر کی طرح روشن معلوم ہوا۔ مگر اختلاف کی وجہ سے متقدمین ومتاخرین کے موقف پر ایسا لطیف حجاب آگیا کہ مسئلہ کے تمام متعلقہ پہلوؤں سے تعرض کرنا ناگزیر ہوگیا تاکہ کوئی شق طلبِ تحقیق نہ رہ جائے اور اس تحقیقی مسافت کے دوران نقد وقدح کے جو نشیب وفراز سامنے آئے وہ راہ نوردی میں وقفۂ استراحت بنتے گئے۔ بالآخر منزل مقصود پر اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق خاص سے پہنچادیا اور اب مسئلہ مبحوث عنہا کے مالہ وماعلیہ پر ایسی سیر حاصل بحث کردی گئی ہے کہ بلاریب عرض کرتا ہوں کہ سلف اور خلف کا موقف صحیح کالشّمس فی نصف النہار واضح ہوگیا۔ جسے اہل علم وبصیرت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بالخصوص یہ مضمون ،،وجوبِ ادا، وقتِ معین کے ساتھ خاص ہے'' اور ''تعدّد وتکرار کی بحث'' اختلاف کا عقدہ حل کرنے میں عظیم باب ثابت ہوا ہے اور یہ محض اللہ کا فضل اور اساتذہ کرام کی عنایتیں ہیں۔ ورنہ میری استعداد کہاں کہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لاسکوں۔ فلیتذوق ومن لم یذق لم یدر.

البتہ الفاظ کا اختصار اور اس میں اعتبارات وحیثیات کی قیدوں کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے اور پورے جزم اور حزم کے ساتھ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے نام درج ذیل ہیں۔ (۱) تحقیق الکلام فی بیان السبب لوجوب الاحکام (۲) رفع الارتیاب من سببیۃ الوقت للموقتات (۳) تمیز الطرقات لتحقق الشرائط للقربات (۴) نور السنٰی لمن یجب علیہ الاضحیۃ بالغِنٰی (۵) تعقب الفرید علی تخصیص الوجوب بصبح العید (۶) کشف الغطاء عن اعتبار الوقت لمحل الاداء. سہولت کے لئے بہتر ہے کہ پہلے

نورالسنٰی پھر کشف الغطاء اور پھر بقیہ مقالات کا مطالعہ فرمائیں۔ان تحقیقات کی قدر کرنے والے اوراس سے موافقت کرنے والے ہندو بیرون ہند میں بے شمار اہل علم ہیں اور زبانی تائید کرنے والے بھی کثیر ہیں۔اور تحریر سے جنھوں نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے،ان میں سے یہاں صرف چار شخصیتوں کی تصدیق پر اکتفاء کرتا ہوں۔

(الف) ازحضرت مولانا محمد انیس خاں صاحب دامت برکاتہم

استاذِ حدیث وفقہ، مدرسہ مظاہر العلوم، سلیم، تامل ناڈو

مکرم ومحترم مفتی رشید احمد صاحب فریدی زیدت مکارمکم

السلام وعلیکم ورحمۃ وبرکاتہٗ

جامعہ علوم القرآن جمبوسر ضلع بھروچ صوبہ گجرات میں ماہِ رمضان المبارک کے اعتکاف کے وقت آپ نے ''قربانی'' سے متعلق ایک رسالہ پیش فرمایا تھا۔پھر بذریعہ ڈاک ملحقہ تحریر ملی۔ دونوں کو من اولہ الی آخرہ مطالعہ کیا۔الحمدللہ ہر بات مدلل، مبرہن پیش کی گئی ہے۔تحقیق وتدقیق خوب فرمائی ہے۔جس سے زیر بحث مسئلہ ''مضحی اور مکان اضحیہ کے وقت کا متحد ہونا یوم النحر میں لازم نہیں ہے'' ثابت ہوجاتا ہے۔

ماشاء اللہ آں محترم نے اس سلسلے میں بڑی تحقیق وجستجو فرمائی ہے۔یہ علمی سرمایہ ہے۔مختلف کتب کے مضامین ومواد کو یکجا فرمادیا ہے۔اب یہ مقالہ نہیں رہا مستقل رسالہ بن گیا۔علمی حلقہ کیلئے قیمتی سرمایہ ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء.

بندہ کی طرف سے آپ ممنون ومشکور ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے، طاقت دے، زور قلم میں اضافہ فرمائے۔

(۱) ''تعامل'' اصول فقہ میں نہایت ہی موثر اور جاندار دلیل ہے۔اس سے صرف نظر کیسے کرلیا گیا تعجب ہے۔(یعنی نئے موقف کے فتاویٰ میں۔رشید)

(۲) ''ہدی'' فی ایام الحج نیز مسافر الی الحج کے ساتھ قربانی کرنے کے لئے رقم بھیجنا ابتدائے اسلام سے چلا آرہا ہے۔آج تک کی ہدی اور قربانی جو اس طرح کی گئی ہے اس کا ''مضحی'' کے مکان وقیام گاہ سے وقت کے موافقت نہ ہونے کی صورت میں ضائع ہوجانا یا واجب کا ادا نہ ہونا لازم آتا ہے جو بالکل غیر مناسب بات ہے۔

(۳) ''بعد ادائے صلاۃ عید کی شرط'' (کی وجہ سے المعتبر مکان الاضحیہ کی شرط) کو جزوی شرط قرار دینا بلا دلیل وبرہان کی بات ہے۔حالانکہ اس کے ساتھ یہ جزئیہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے تھا

کہ مصر میں بدوی کا جانور قبل الصلوٰۃ ذبح کردیا گیا تو واجب ادا نہیں ہوتا اور قریہ میں مصری کا جانور قبل الصلاۃ فی المصر ذبح کردیا تو واجب ادا ہوجاتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ "المعتبر مکان الذبیحة لامکان المضحی"

فقط محمد انیس ۱۴۲۶/۱۲/۱۴ھ ۲۰۰۶/۱/۱۵ء

(ب) از ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ حضرت مولانا ابراہیم صاحب پٹنی مدظلہ العالی
سابق استاذ حدیث وتفسیر جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل وخلیفہ حضرت فقیہ الامتؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از بندہ محمد ابراہیم پٹنی عفی عنہ

بخدمت گرامی مولانا مفتی رشید احمد صاحب فریدی زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

آپ کا تحقیقی مقالہ پہنچا۔ اچھا ہوا کہ اس کو مرتب اور مزید مبرہن کردیا۔ چونکہ نفس وجوب، وجوب ادا، اوران کے مابین فصل، نیز سبب، علّت اور شرط اوران کے مابین فرق، پھران میں سے انعقادِ حکم میں مؤثر یا مانع کون ہے؟ وغیرہ مباحث اصولی اور دقیق بھی ہیں، آپ نے ان کو کافی حد تک سہل کردیا ہے اور نفس مسئلہ "المعتبر مکان الاضحیہ" بے غبار کردیا ہے۔

اور اخیر میں خلاصہ الکلام بھی تحریر فرمایا ہے۔ فجزاکم اللہ خیرا۔ حق تعالیٰ شانہ اس کو مفید سے مفید تر بنائے اور اس نوع کی مزید خدمات سے نوازے جو امت کیلئے باعث سہولت ونشاطِ عمل ہو۔ شرح المواقف اور البحر المحیط فی اصول الفقہ للامام بدرالدین الزرکشی المتوفی ۷۹۲ھ ج ۳ بحث المفہوم بھی دیکھ لیتے تو اچھا ہوتا۔

محمد ابراہیم پٹنی عفی عنہ
۱۲/ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ بھٹئی

(ج) از حضرت مفتی محمد فاروق صاحب مدظلہٗ العالی
جامع ومرتب فتاویٰ محمودیہ، بانی وشیخ الحدیث جامعہ محمودیہ، نوگزہ پیر، میرٹھ

حامداً ومصلیاً امابعد محترمی ومجی مولانا مفتی رشید احمد فریدی زید مجدہم کا رسالہ "ذبح اضحیہ کیلئے مکان اضحیہ کا اعتبار ہے" سے متعلق دیکھنے کی سعادت میسر آئی۔ مسرت ہوئی۔ الحمدللہ موصوف نے بڑی محنت فرمائی ہے۔ بندہ کو موصوف کی رائے اور تحقیق سے اتفاق ہے۔ زمانہ قدیم سے اسی پر تعامل بھی چلا آرہا ہے۔ اسی میں آسانی اور سہولت بھی ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ موصوف کی محنت کو قبول فرمائے، ترقیات سے نوازے اور اس نوع کے علمی کاموں کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط

محمد فاروق غفرلہ

۱۴۲۹/۹/۱۶ھ

خادم جامعہ محمودیہ، علی پور، ہاپوڑ روڈ، میرٹھ، یوپی

(د) از جامع المعقول والمنقول حضرت مفتی یوسف صاحب تاولوی دامت برکاتہم

استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

مکرم ومحترم جناب مولانا مفتی رشید احمد صاحب زید معالیکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا تحقیقی علمی مقالہ مع مکتوب گرامی موصول ہوا۔ فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اس باب میں اصول وفروع مکانِ تضحیہ کے اعتبار کے مؤید ہیں۔ آپ نے اس باب میں کافی وافی مواد جمع فرمادیا ہے۔ گو بعض مباحث غیر ضروری بھی آگئے ہیں۔ مگر ایسے مواقع میں یہ طریق اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ حق تعالیٰ آپ کی محنت کو مثمرِ خیر بنائے۔ آمین۔ والسلام

محمد یوسف

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۰/۷/۲۷ھ

(۵) وقت معین کے ساتھ وجوب ادا مختص ہے نہ کہ وجوب فی الذمہ

وجوبِ ادا یعنی مامور بہ کی ادائیگی کا مطالبہ خطابِ الٰہی سے اور خطاب وقت معین میں ہوتا ہے اس سے قبل نہیں یہ فقہ کا مسلّمہ اصول ہے۔

(۱) ان وجوب الاحکام متعلق باسبابها وانما یتعلق بالخطاب وجوب الاداء (اصول بزدوی)

(۲) الثانی وجوب الاداء وهو اسقاط ما فی الذمة وتفریغها من الواجب وانه ثبت بالخطاب. (بدائع)

(۳) فسبب وجوب الصلوة الوقت بدلیل ان الخطاب باداء الصلاة لایتوجه قبل دخول الوقت وانما یتوجه بعد دخول الوقت والخطاب مثبت لوجوب الاداء ومعرف للعبد سبب الوجوب قبله (اصول الشاشی)

(۴) ووجه ما تقرر فی علم الاصول من ان وجوب الاداء فی الموقتات التی یفضل الوقت عن ادائها کالصلاۃ ونحوها انما یثبت آخر الوقت اذھنا یتوجه الخطاب حقیقةً (تکملہ فتح القدیر)

(۵) وسببها الاصلی خطاب اللّٰه تعالیٰ ای سبب وجوب ادائها. (مراقی)

(۶) واسبابها اوقاتها وتجب ای یفترض فعلها باول الوقت وجوباً موسعاً فلا حرج حتی یضیق عن الاداء ویتوجه الخطاب حتماً (مراقی الفلاح)

(۷) ویخرج (ای لصلوۃ الجمعه) حین تزول الشمس لان الخطاب یتوجه بعده. (ہدایہ اول)

(۸) و سبب لزوم ادائها هذا هو السبب الحقیقی توجه الخطاب ای الخطاب المتوجه الی المکلفین بالامر بالاداء (شامی)

(۹) واما وجوب الاداء الموقوف علی مطالبة الشارع فهو یتحقق بعد حولان الحول. (عمدۃ الرعایہ)

(۱۰) تجب علی حر مسلم مالك النصاب او قیمته و ان لم یحل علیه الحول عن طلوع فجر یوم الفطر. قوله عند طلوع. بیان لوقت وجوب الاداء (نورالایضاح مع حاشیہ)

(۱۱) وقد یجامع الشرط السبب مع اختلاف النسبة کوقت الصلاۃ فانه شرط بالنسبة الی الاداء وسبب بالنسبة الی وجوب الاداء (تقریر وتحبیر)

(۱۲) .... ان الوجوب عند الاداء او فی آخر الوقت فاذا مات قبل الاداء مات قبل ان تجب علیه کمن مات فی وقت الصلاۃ قبل ان یصلیها انه مات ولا صلوۃ علیه (بدائع)

مذکورہ اصولی وفقہی عبارات سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وجوب ادا، وقتِ معین کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ادا، کے وجوب کا ثبوت خطاب سے اور خطاب وقت سے قبل نہیں ہوتا۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وقتِ معین کی آمد سے ثابت ہونے والا وجوب وہ وجوب الادا، ہے جو ادا، یعنی مامور بہ کی ادائیگی سے متصل ہوا کرتا ہے نہ کہ وہ وجوب جو ادا، سے منفصل اور وجوبِ ادا، سے بھی مقدم ہوا کرتا ہے جسے اصلِ وجوب یا نفس وجوب اور اہلیت وجوب بھی کہتے ہیں۔

نیز انتقال سببیت والی دلیل جیسا کہ راقم نے اپنے پہلے مقالہ میں پیش کی ہے الفاظ کے کچھ

فرق کے ساتھ تقریباً تمام کتب اصول اور امہات کتب فقہ میں موجود ہے وہ بالکل صاف اور صریح ہے کہ سبب کا انتقال وجوبِ ادا، سے متعلق ہے۔ اس کے باوجود اگر وقت خاص کو نفس وجوب یعنی ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے کے لئے اساس وعلّت قرار دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے وقتِ خاص کے گذر جانے کے بعد ادا، تو کیا قضاء کا مسئلہ بھی باقی نہ رہے گا کیونکہ ما یثبت به الشیء کے عدم سے شئی کا نہ ہونا ظاہر ہے۔

(۱) پس وقتِ خاص کے گذر جانے سے نفس وجوب زائل ہوجائے گا۔

(الف) جیسے اسلام پر نفس وجوب موقوف ہے کوئی شخص نعوذ باللہ اگر مرتد ہوجائے گا تو نفس وجوب ہی ختم ہوجاتا ہے۔

(ب) اور جیسے عقل پر نفس وجوب موقوف ہے لیکن اگر کسی کو جنون مطبق لاحق ہوگیا تو نفس وجوب باقی نہیں رہتا ہے۔ عبادات کی ادا، بلکہ قضاء کا بھی مطالبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ (مذکورہ دونوں امر شرط وجوب ہیں)

(ج) اور جیسے ملک نصاب پر زکوٰۃ کا نفس وجوب موقوف ہے۔ نصاب نامی فاضل عن حوائجہ الاصلیہ کا مالک بننے کے بعد حولان حول سے پہلے یا بعد میں بہرحال ادائے زکوٰۃ سے پہلے اگر وہ فقیر وکنگال ہوگیا تو سرے سے نفس وجوب ہی رخصت ہوجاتا ہے۔

(۲) صدقہ الفطر کے لئے وقت خاص یعنی طلوع صبح یوم الفطر شرط ہے وجوب ادا، کی نہ کہ نفس وجوب کی۔ پس اگر وقت خاص کو نفس وجوب میں موثر مانیں تو لازم آئے گا کہ مالک نصاب ہونے کے باوجود طلوع فجر یوم الفطر سے پہلے صدقہ ادا کرنا صحیح نہ ہو۔ اور جب باتفاق احناف اور ظاہر الروایت کے مطابق صبح صادق سے قبل صدقہ الفطر ادا کرنا صحیح ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ وقت خاص کو نفس وجوب میں قطعاً دخل نہیں ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ صدقہ الفطر کا نفس وجوب رأس یمونہ ویلی علیہ کی وجہ سے ہے جس کو سبب وجوب کہا گیا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ورنہ بغیر غنائے شرعی کے یوم العید سے پہلے واجب صدقہ ادا، ہوجانا چاہیے اس لئے کہ وقت سے نفس وجوب کے قائلین نے غنا کو نفس وجوب کی شرط نہیں مانا ہے اور وجوب ادا، کی شرط سے پہلے ادا، جائز ہے جیسے حولان حول سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا۔ پس معلوم ہوا کہ رأس یمونہ کو سبب وجوب قرار دینا وجوب ادا، کے تعدد وعدم تعدد کی معرفت کیلئے ہے۔

(۳) قربانی کے وقت خاص (از طلوع فجر یوم النحر تا غروب ثانی عشر) کو سبب وجوب کہا گیا ہے۔ راقم السطور نے پوری تحقیق وتدقیق سے فقہی واصولی صریح عبارتوں سے دکھادیا ہے کہ

ایام نحر سبب وجوب ادا ہے۔ مگر جدید موقف کے قائلین دوسرے حقائق اور نتائج سے قطع نظر کرتے ہوئے وجوب ادا کے مقابل نفس وجوب (اصطلاحی) مراد لیتے ہیں۔

لہٰذا ایام نحر کی آمد پر ہی نفس وجوب (یعنی ذمہ مشغول بالواجب) ہوتا ہے تو....

(الف) اگر فقیر (غیر مالک نصاب) نے ابتدائے یوم النحر میں قربانی کی اور ختم ایام سے پہلے غنی ہوگیا تو دوبارہ اس پر قربانی کرنا واجب الاعادہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ بقول آپ کے قربانی نفس وجوب کے بعد وقت ادا میں کی گئی ہے۔ حالانکہ بالاتفاق وقت وجوب کے ختم سے پہلے غنا کا اگر تحقق ہوگیا تو قربانی واجب ہوگی اور پہلے والی قربانی بہرحال نفل کہلائے گی۔ اس صورت میں اگر آپ کہیں کہ شرطِ وجوب (غنا) نہیں پائی گئی اس لئے واجب ادا نہیں ہوئی تو میں کہوں گا کہ (آپ نے غنا کو محض شرطِ وجوبِ ادا کی حیثیت دی ہے اس لئے ادا، مالی عبادت میں وقت وجوبِ ادا سے پہلے جائز ہے۔ جیسے زکوۃ حولان حول سے قبل اور صدقہ الفطر صبح یوم الفطر سے پہلے ادا کرنا احناف کے نزدیک درست ہے اور یہاں فقیر کی قربانی وقت وجوبِ ادا میں ہوئی ہے۔ البتہ ادا، شرطِ نفس وجوب اور شرط صحت ادا سے مقدم نہیں ہوسکتی)

(ب) اور اگر غنا کے تحقق کے بعد ذمہ مشغول بالواجب ہو رہا ہے جیسا کہ اوپر والے مسئلہ سے بخوبی ظاہر ہے تو بالیقین معلوم ہوا کہ وقت خاص کے دخول سے ذمہ مشغول بالواجب نہیں ہوا۔

(ج) اور اگر وقت خاص کو مع شرط غنا کے نفس وجوب کا سبب کہا جائے جیسا کہ جدید موقف کا لازمی تقاضہ ہے تو پھر شرائط وجوب کا ابتدائے وقت سے ہونا ضروری ٹھہرے گا حالانکہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ شرائط وجوب کا ابتدائے وقت سے ہونا لازم نہیں ہے۔ وقت اخیر میں ہونا معتبر ہے۔

(د) اور اگر مان لیں کہ مالدار (شرعاً غنی) پر صبح یوم النحر کی آمد سے نفس وجوب ہوگیا اب واجب قربانی صحیح ہے چاہے خود کرے یا اس کا نائب جیسا کہ کراچی کے فتویٰ میں موجود ہے تو میں عرض کروں گا:

اگر من علیہ الاضحیہ نے قربانی کرنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ ایام نحر گذرنے سے پہلے وہ فقیر ہوگیا تو دخولِ وقت سے نفس وجوب ماننے کا مقتضاء یہ ہے کہ پھر بھی واجب قربانی ادا ہوجانی چاہیے حالانکہ بالاتفاق قربانی کا وجوب ہی ساقط ہوجائے گا کیونکہ ملک نصاب (غنا) قربانی کے وجوب میں شرط محض نہیں ہے جس کا وقت وجوب میں (صدقہ الفطر کی طرح) صرف پایا جانا کافی

ہے بعد میں چاہے وہ شرط نہ رہے بلکہ زکوٰۃ کی طرح یہ شرط فی معنی العلۃ ہے جس کا ادا تک باقی رہنا وقت ادا میں ضروری ہے۔ وهذه لانها تشبه الزكوة من حيث انها تسقط بهلاك المال قبل مضى ايام النحر كالزكوة بهلاك النصاب. (ہدایہ ص۴۴۶ کتاب الاضحیہ)

... لانها تسقط بالهلاك قبل مضى ايام النحر كالزكوة تسقط بهلاك النصاب (ای مطلقاً) (فتح العنایہ شرح نقایہ ص۲/۲۶۹) ودیگر کتب فقہ

(ھ) مزید براں اگر نفس وجوب وقت (خاص) سے اور وجوب ادا غنا وغیرہ سے مانیں جیسا کہ خیال کیا گیا ہے اور وقت (ایام نحر) شرط ادا، تو ہے ہی تو لازم آئے گا کہ شرطِ ادا نفس وجوب کے ساتھ مجتمع ہو حالانکہ شرطِ ادا کا اجتماع سبب وجوب ادا کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے یہی وجوب متصل بالادا ہوتا ہے۔ وقد يجامع الشرطُ السبب. مع اختلاف النسبة كوقت الصلاة فانه شرط بالنسبة الى الاداء وسبب بالنسبة الى وجوب الاداء کیونکہ وجوبِ ادا میں وجوب متصل بالادا ہوتا ہے نفس وجوب ادا سے منفک ومقدم ہوتا ہے۔

(۴) وقت خاص للعبادات ہی کو اگر نفس وجوب (ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے) کا ذریعہ مانا جائے تو اس سے شرعی وفقہی مسلمہ اور اصل الاصول کی مخالفت ہوگی وہ ہے القربات الموقتة يعتبر وقتها فى حق فاعلها لا فى حق المفعول عنه اور یہ متفق علیہ ضابطہ ہے۔ چنانچہ حج عن الغیر میں دیکھئے ارکان وواجبات کی ادائیگی میں وقت کی رعایت فاعل یعنی حاج عن الغیر کے حق میں ضروری ہے نہ کہ محجوج عنہ کے اعتبار سے اور حج عن الغیر کا سلسلہ حضور ﷺ کے زمانہ سے جاری وساری ہے۔ ہر سال ایک معتد بہ مقدار اُن حاجیوں کی بھی ہوتی ہے جو کسی صاحب استطاعت معذور کی طرف سے حج فرض ادا کرنے کیلئے بھیجے جاتے ہیں۔ وقوفِ عرفہ (مع دیگر فرائض حج کی ادائیگی) کے لئے وقت کا لحاظ حجاج کے حق میں ہے۔ حالانکہ جن کی طرف سے حج بدل کیا جارہا ہے ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو دنیا کے مختلف ایسے خطوں میں ہوتے ہیں جہاں یا تو یوم عرفہ نہیں ہے یا وقت وقوف عرفہ نہیں ہوا ہے یا پھر وقوف کا اصل وقت گذر چکا ہے۔

کیونکہ ذمہ کا مشغول بالحج ہونا استطاعت پر موقوف ہے اور استطاعت سے محجوج عنہ متصف ہے لہٰذا نفس وجوب قائم ہے۔ رہا بیت اللہ کو سبب وجوب قرار دینا سو یہ وجوبِ ادا کے توحد وعدم تکرار کی معرفت کے لئے مقرر کیا گیا ہے جو کہ سبب ظاہر ہے وانما اشكل على الاقرع بن حابس لانه من الجائز ان يكون سبب الحج ما يتكرر وهو وقته كالصوم والصلاة ومن الجائز ان يكون سببه مالا يتكرر وهو البيت فبيّن صلى الله عليه وسلم

ان السبب ہو البیت فلہذا سأل لالکون الامر محتملاً للتکرار. (البحرالعمیق فی مناسک المعتمر والحاج الی بیت اللہ العتیق، ج۱،ص ۳۵۷) اور وقت یعنی ایام حج فقط شرطِ ادا ہے۔

اسی اصل الاصول کی ایک فرع المعتبر مکان الاضحیہ ہے اور یہ بھی اصل کلی ہے جس پر تمام فقہا کا اتفاق ہے یعنی وقت کا اعتبار فاعل یعنی ذابح کے حق میں ہوگا نہ کہ مذبوح عنہ (یعنی من علیہ الاضحیہ یا من منہُ الاضحیہ) کے حق میں لان الذبح ہو القربۃ فیعتبر مکان فعلہا لامکان المفعول عنہ (بدائع) اور اسی کلی پر متفرع وہ جزئی ہے جو حیلۃ المصری الخ کے عنوان سے کتب فقہ میں درج ہے اور یہ بھی مسلّم اور معمول بہ ہے۔ اس میں بھی احناف کا اختلاف نہیں ہے۔ ان اصول وقواعد کا تعلق ادا یعنی قربت کی انجام دہی سے ہے خواہ قربت (قربانی) واجب ہو کہ نفل۔ رہا قربانی کا واجب ہونا سو یہ اپنی جگہ بیان کیا گیا کہ وجوب اضحیہ کی علت غنا ہے۔

اب اگر وقت خاص ہی کو ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے کا سبب مانیں کما زعموا تو ان کلیات ومسلّمات کا عموم ہی باطل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا دخول وقت سے نفس وجوب کے تحقق کا موقف شرعاً وفقہاً غلط ہے۔ (بقیہ آئندہ)

❁ ❁ ❁

کیا تعلیمات نبوی ﷺ پر مسیحیت کا اثر ہے؟

از: ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی
شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذرائع علم کیا تھے؟ خاص طور پر مغرب کے نزدیک یہ مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ اگر وحی کو ذریعہ ابلاغ تسلیم کرلیا جائے تو سارا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ محمدؐ کو نبی تسلیم نہیں کرنا ہے، اس لیے وحی کے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی مشکل سے انہیں بشریت کا مقام دیا گیا تو عیسائی کلیسا کا رکن سمجھا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نبیؐ کے معلّمین کا رکنان کلیسا تھے۔ اتفاق سے شام کے تجارتی اسفار کا واقعہ مستشرقین کی نظر سے گزرا، تو پھر ان کے لیے راہبوں کو معلم ثابت کرنے میں کوئی کلام نہیں رہ گیا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ مختصر وقت کی ملاقات تعلیم وتعلم کے لیے کافی نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے معلّمین کو عرب میں تلاش کیا گیا۔ مستشرقین کی نظر ورقہ بن نوفل پر پڑی۔ بڑے وثوق سے کہا گیا کہ یہی آپ کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ ان لوگوں نے معلّمین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی تو یہ بھی کہا کہ زید بن حارثہؓ چوں کہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے اور ان کا تعلق عیسائیت سے تھا، اس لیے مذہب کی تشکیل وتفہیم میں ان سے مدد لی ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا کہ حضرت بلال حبشیؓ اور ماریہ قبطیہؓ کا تعلق بھی عیسائیت سے تھا، کوئی بعید نہیں کہ ان لوگوں سے بھی آپؐ نے عیسائیت سے واقفیت حاصل کی ہوگی۔ ان سارے لوگوں کا معلّمین ہونا مستشرقین نے ناکافی سمجھا تو ان اہل کتاب عالموں کو بھی اس فہرست میں شامل کردیا، جو مکہ کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔ بیش تر مستشرقین مثلاً: سر ولیم میور، بلاشیر، ڈریپر، باڈلے، فلیپ ایرلنگی اور گولڈ زیہر وغیرہ نے اسی بات پر زور دیا ہے۔ 'ڈریپر' لکھتا ہے:

''بحیرا راہب نے بصری کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی... آپ کے ناتربیت یافتہ اخّاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات

کا گہرا اثر قبول کیا... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو لیا تھا۔''(۱)

'فلیپ ایرلنگ' اپنے ایک مضمون میں متضاد اور ناقابل تسلیم رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''محمدؐ کی مکہ میں اکثر یہودیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھیں... محمد اپنے خادم زید سے جو عیسائیوں کا غلام رہ چکا تھا یہودیوں اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفادہ کی غرض سے سوالات کیا کرتے تھے وہ اپنے خادم سے زیادہ سمجھ دار تھے... مدینہ میں محمد یہودیوں کے شاگرد رہے، یہودیوں ہی نے آپ کی شخصیت سازی کی تھی یہودیوں اور مسیحیوں میں جو داستانیں مشہور تھیں جبرئیل ان سب کو محمد کے سامنے بیان کردیا کرتے تھے۔''(۲)

مکہ کے ماحول میں تعلیم کا حصول ممکن نہ تھا

قریش مکہ کو اپنی زبان دانی پر ضرور ناز تھا۔ مگر ان کے اندر نوشت وخواند سے دل چسپی نہیں تھی۔ یہ صورت اس وقت تک برقرار رہی جب تک کہ محمد ﷺ نے نبوت سے سرفراز کیے جانے کے بعد ان لوگوں کے اندر پڑھنے لکھنے کا داعیہ نہ پیدا کردیا۔ حضور ﷺ کے ابتدائی حالات سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپ کی پرورش جس ماحول اور معاشرہ میں ہوئی اس میں حصول علم کے ذرائع اور مواقع مفقود تھے۔ خاص کر اس بچہ کے لیے جس کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ چکا ہو، علم حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ ابوطالب کوئی اتنے بڑے مال دار اور فارغ البال بھی نہ تھے کہ اپنے بچوں سے توجہ ہٹا کر صرف حضور ﷺ کی تعلیم پر توجہ دیتے۔ اس لیے یہ بات سرے سے بے بنیاد ہے کہ آپ نے حصول علم کے لیے معلّمین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، جس کے اثرات نبوت کے بعد ظاہر ہوئے، یا اس سے قبل آپ ﷺ نے جس سنجیدگی اور فرزانگی کا مظاہرہ کیا وہ اسی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ بلکہ آپ کا طریقہ زندگی ٹھیک اسی نہج پر پروان چڑھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ کی زندگی۔ وہ کم عمری میں بتوں کے مخالف ہوگئے اور جستجوئے حق میں سرگرداں رہتے۔ (الانبیاء: ۵۱-۵۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت کے دلائل

یہ بات تو طے ہے کہ آپؐ امی تھے۔ قرآن نے بار بار آپ کو اسی لقب سے یاد کیا اور متعارف کرایا ہے۔ چنانچہ کفار ومشرکین کے شکوک وشبہات کا ازالہ اور ان کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے:

”فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔“ (الاعراف:۱۵۸)

(پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید کہ تم راہ راست پالوگے۔)

ایک اور مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امی محض کے طور پر تعارف کراتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

”وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذاً لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ.“ (العنکبوت:۴۸)

(اے نبی) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ جاتے۔)

نبی امی کی پیروی کرنے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

”وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاؤُوا ظُلْماً وَزُوراً. وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلاً. قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً.“ (الفرقان:۴-۶)

(جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کردیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ ان منکرین نے خلاف واقع من گھڑت بات کہی اور کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ جنہیں یہ شخص نقل کرلیتا ہے اور وہی صبح وشام اس کے پاس لکھی جاتی ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

وہ بڑا غفور ورحیم ہے۔)

چالیس سال کی عمر میں غار حرا کے اندر جبرئیل امین وحی لے کر آئے اور آپ سے کہا کہ اے محمدؐ پڑھیے۔ آپؐ بار بار یہی کہتے رہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتہ وحی نے جب آپ کو سینہ سے لگا کر بھینچا تو آپ پڑھنے لگے۔(۳) یہ اور بعض دوسرے واقعات سے یہ بات مزید واضح ہوجاتی ہے کہ آپ پڑھنے لکھنے سے واقف نہ تھے۔ نبوت سے سرفراز کیے جانے کے بعد تبلیغ دین کے لیے آپ نے بہت سے حکم رانوں کے نام خطوط اور فرامین لکھوا کر بھیجے۔ اگر آپ نوشت وخواند سے واقف ہوتے تو ایسا کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار کے قابل اعتراض لفظ کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے کو حضورؐ نے حضرت علی سے کہا۔ انہوں نے احترام نبوی کا لحاظ کرتے ہوئے جواب دیا یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ اس پر حضورؐ نے علی سے فرمایا بتاؤ وہ لفظ کہاں ہے۔ حضرت علی نے انگلی رکھ کر بتادیا۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اسے مٹایا اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھوا دیا۔(۴) برسوں علمی ماحول میں رہنے کی وجہ سے بعض لوگ کم ازکم اپنے نام کا املا کرہی لیتے ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اور نہ اس سے پڑھے لکھے ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانہ تک آپؐ کے اندر لکھنے پڑھنے کی شدید پیدا ہوگئی تھی۔ مگر یہ تمام روایتیں موضوع اور کم زور ہیں۔(۵)

کفار مکہ نے راہبوں سے علمی استفادہ کا الزام نہیں لگایا

بتوں کی مذمت اور عقائد واعمال کے مفاسد کی باتیں سننا کفار ومشرکین کے نزدیک دل شکن بات تو تھی، مگر ان کے لیے زیادہ اچنبھے والی بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی اطلاع آخر نبی کو کہاں سے مل رہی ہے۔ وہ تو پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ سابقہ کتابوں سے معلومات اخذ کرسکیں۔ ہو نہ ہو یہ فلاں فلاں عجمی غلاموں سے جنہیں آسمانی کتابوں کا علم ہے، معلومات حاصل کرتے ہوں۔ ان کے نزدیک معلومات کے ذرائع ان کے علاوہ شام کے راہب ہوتے تو وہ ضرور اس کی تشہیر کرتے اور کہتے یہ باتیں انہیں سے سیکھی تھیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبیؐ کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بحیرا راہب سے جب ملے تھے، اس وقت یہ سارے مضامین ان سے سیکھ لیے تھے اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے، اس زمانے میں تم نے عیسائی اور یہودی علما سے یہ

معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ سفر اکیلے نہیں قافلے کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کسی سے کچھ سیکھ کر آنے کا الزام لگائیں گے تو اپنے ہی شہر والے جھٹلائیں گے۔ اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں بحیرا سے حاصل ہوگئی تھیں تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا، بستا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس کے علم و دانش کی غمازی کرتا؟ (۶)

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آں حضرتؐ کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳ ربرس تک قائم رہی، اگر آں حضرت ﷺ کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی حد تک خلوت وجلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقت ضرورت (نعوذ باللہ) آپ اس سے قرآن بنواتے، احکام ومواعظ سیکھتے، اسرار ونکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا، کیوں کہ جو شخص خود مدعی نبوت کو تعلیم دے رہا ہو، وہ کیوں کر اس کی نبوت کو تسلیم کرسکتا تھا اور پھر اس شہرت عام، ذکر جمیل، رفعت مقام کو دیکھ کر جو مدعی نبوت کو حاصل ہو رہی تھی، وہ خود پردہ کے پیچھے گم نامی پسند کرتا اور صحابہ کرام کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا، جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا، اگر حقیقت میں آپؐ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے تو قریش جو آپ کی تکذیب، تذلیل اور آپ کو خاموش کرنے کی تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے، ان کے لیے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو الگ کردیتے کہ محمد رسول اللہ کا وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتاً درہم برہم ہوجاتا، علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کا وجود مکہ میں تھا، پھر مدینہ میں ۱۳ ربرس تک سینۂ نبوت سے فیضان الٰہی کا سرچشمہ کیوں کر ابلتا رہا، قرآن شریعت اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے، مکہ میں تو نسبتاً بہت کم سورتیں نازل ہوئیں۔'' (۷)

شام کے تجارتی سفر کا تفصیلی پس منظر

حضورؐ کے تجارتی سفر جو بچپن میں ہوئے اس کی تفصیل جامع الترمذی میں بیان کی گئی

ہے۔حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں:

''ابوطالب رؤسائے قریش کے ہمراہ (ملک) شام کی طرف (تجارت کے لیے) چلے۔آپ کے ہمراہ رسول اللہ بھی اس سفر میں تھے۔ جب (بحیرا) راہب کے مکان (یاصومعہ) کے قریب پہنچے تو ابوطالب اترے اورلوگوں نے اپنے کجاوے کھول دیئے۔ پادری (راہب) ان کے پاس آیا،اس سے پہلے بھی یہ لوگ یہاں سے گذرا کرتے تھے ،مگر راہب ان کے پاس نہ آتا تھا بلکہ التفات بھی نہ کرتا تھا۔(اب کی دفعہ خلاف معمول خود چل کر آیا) یہ لوگ ابھی کجاوے کھول ہی رہے تھے کہ وہ ان کے درمیان گھس کر چلنے لگا، یہاں تک کہ اس نے آکر رسول اللہ کا ہاتھ پکڑ لیا اوراس نے (لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا: یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول ہیں۔اللہ تعالی ان کو عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کرے گا اور یہ تمام عالم کے سردار ہیں۔رؤسائے قریش نے پوچھا یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔پادری نے کہا جس وقت تم لوگ عقبہ سے چلے ہو تو جتنے پتھر اور درخت تھے،سب سجدہ میں گر پڑے۔ایک پتھر اور ایک درخت بھی ایسا نہ رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہوا۔درخت اور پتھر سوائے پیغمبر کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے اور میں ان کی مہر نبوت بھی پہچانتا ہوں جو آپ کے مونڈھے کی ہڈی کے نیچے سیب کی مانند ہے ،پھر وہ پادری واپس چلا گیا اوران لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنے لگا جس وقت وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا تو آپ اونٹوں کے چرانے میں مصروف تھے۔اس نے آپ کو بلا بھیجا،جس وقت حضورؐ وہاں سے چلے تو ایک بدلی آپ کے سر پر سایہ کیے ہوئے تھی، جب آپ لوگوں کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ مجھ سے پہلے درختوں کے سایوں کی جگہ قبضہ کر چکے ہیں۔ جب آپ بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ پر جھک گیا، پادری نے لوگوں سے کہا۔دیکھو اس درخت کا سایہ آپ پر جھک گیا ہے۔راوی کہتے ہیں کہ وہ پادری ان کے پاس کھڑا ہوا قسمیں کھا کھا کر ان کو سمجھا رہا تھا کہ ان کو روم کی طرف نہ لے جاؤ، کیوں کہ رومی لوگ اگر ان کو دیکھیں گے تو صفت وعلامات سے ان کو پہچان لیں گے (کہ یہ اللہ تعالی کے برگزیدہ نبی ہیں) اور آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔اتنے میں اس نے منھ موڑ کر کیا دیکھا

کہ سات آدمی روم کی طرف سے چلے آرہے ہیں پادری نے ان کا استقبال کیا اور ان سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ؟انہوں نے کہا ہم اس لیے آئے ہیں کہ ایک نبی اس مہینہ میں نکلنے والے ہیں۔پس کوئی راستہ ایسا نہیں جہاں چند آدمی نہ بھیجے گئے ہوں اور ہمیں ان کی خبر ملی ہے تو ہمیں اس راستہ کی طرف بھیجا گیا ہے۔پادری نے پوچھا کیا تم لوگوں کے پیچھے کوئی تم سے بہتر آدمی بھی ہے ؟انہوں نے کہا ہمیں تو آپ کے اسی راستہ کی خبر دی گئی ہے (اور کچھ نہیں بتایا گیا) پادری نے کہا اچھا تو یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالی نے کسی امر کا ارادہ کیا ہو تو کیا انسان کی طاقت ہے کہ اسے روک دے؟انہوں نے کہا نہیں۔الغرض انہوں نے آپ سے بیعت کرلی اور آپ کے ساتھ مقیم رہے۔پادری نے قریش سے کہا تمہیں خدا کی قسم یہ بتاؤ کہ تم میں اس کا ولی (سرپرست) کون ہے؟انہوں نے کہا ابوطالب (آپ کے چچا اور سرپرست ہیں) پادری نے قسمیں دے کر ابوطالب سے کہا کہ انہیں واپس لے جاؤ۔آخر ابوطالب نے آپ کو مکہ واپس بھیج دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کے ہمراہ بلال کو بھیجا اور اس پادری نے آپ کو زادراہ کے لیے روٹیاں اور روغن دیا۔''(۸)

حضور ﷺ کے تجارتی اسفار صحیح تناظر میں

حضور کے تجارتی اسفار جو ملک شام کے لیے ہوئے ،اس سے متعلق جو تفصیلات بعض کتب احادیث وسیر اور تاریخ میں ملتی ہیں اور جیسا کہ ابھی اوپر تفصیلی روایت گزری ہے۔اس میں سے ناقابل فہم باتوں کو نکال دیا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب یہی نکل کر سامنے آتا ہے کہ آپؐ نے پہلی مرتبہ شام کا سفر اس وقت کیا، جب کہ آپ کی عمر مشہور روایت کے مطابق ۱۲ رسال کی تھی۔یہ سفر آپ کا اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ہوا تھا۔جب یہ تجارتی قافلہ منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا، شام کے علاقہ بصری کے مقام پر پہنچا تو ایک جگہ قیام کیا۔یہاں سے کچھ فاصلہ پر عیسائیوں کی ایک خانقاہ تھی۔اس میں بحیرا نام کا ایک راہب رہتا تھا۔خلاف معمول یہ راہب اپنے صومعے سے نکلا اور قافلہ والوں کو دیکھنے لگا۔اسے اس قافلہ والوں میں سے کسی ایک آدمی کے متعلق غیر معمولی باتیں نظر آنے لگیں۔صحیح صورت حال جاننے کے لیے اس نے اس تجارتی قافلہ کی دعوت کی۔وقت مقررہ پر سارے لوگ کھانے کے لیے پہنچے اور دسترخوان پر بیٹھ گئے۔راہب کی نظر اس

کم سن بچہ پر پڑی۔ وہ اسے بغور دیکھتا رہا۔ اسے اس بچہ کے چہرہ بشرہ سے غیر معمولی بلندی کے آثار نظر آرہے تھے اور وہ علامات بھی نظر آرہی تھیں جو نبی آخرالزماںؐ کے متعلق وہ اپنی آسمانی کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ حضورؐ کے قریب ہوا اور آپ سے مخاطب ہوکر کچھ پوچھنے لگا۔ آپؐ نے کم عمر ہونے کے باوجود اس کے سارے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دے دیا۔ اس سے اسے اتنا اندازہ تو ہوگیا کہ ہونہ ہو یہی بچہ آگے چل کر آخری نبی مقرر ہو، مگر اس نے یقین سے کچھ کہنے کے بجائے ابوطالب سے کہا کہ یہ بچہ بلند اقبال والا ہے، تم اس کی اچھی طرح نگہ داشت اور پرورش و پرداخت کرنا۔ ابن اسحاق کے بہ قول بحیرا راہب نے ابوطالب سے یہ بھی کہا:

''آپ اپنے بھتیجے کو وطن واپس لے جائیں اور یہود سے اس کو بچائیں۔ اللہ کی قسم اگر انہوں نے دیکھ لیا اور وہ علامتیں پہچان لیں جو میں نے پہچانی ہیں تو وہ اسے ضرر پہنچائیں گے۔ آپ کا بھتیجا بڑی عظمت والا ہے۔''(۹)

حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ بحث کے شروع میں انہوں نے اس کے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راہب نے ان کے چچا سے حضور کی حفاظت اور اچھی طرح پرورش و پرداخت کرنے کی بات کہی تھی، نہ کہ یہ کہا تھا کہ یہ بچہ نبی آخرالزماں بننے والا ہے۔(۱۰) ابن جریر طبری نے اس واقعہ سے متعلق تمام رطب و یابس باتوں کو حذف کردیا ہے، البتہ انہوں نے ابوموسیٰ اشعری کے حوالے سے وہی روایت نقل کی ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔(۱۱)

شام کا دوسرا واقعہ اور نسطورا سے ملاقات کی اصلیت

اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ بھی ملک شام میں اس وقت پیش آیا جب کہ آپ ﷺ کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ آپ کا یہ سفر بھی تجارت کی غرض سے ہوا تھا۔ حضرت خدیجہ کا مال لے کر جارہے تھے۔ آپ کے معاون کے طور پر حضرت خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو ساتھ کردیا تھا۔(۱۲) جب یہ تجارتی قافلہ شام کے علاقہ بصری میں پہنچا تو سب لوگوں نے پڑاؤ ڈالا۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے آپ ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگے۔ اب کی بار نسطورا راہب اپنے خیمہ سے نکل کر قافلہ والوں کے پاس آیا۔ یہاں تک کہ اس نے میسرہ سے پوچھا کہ اس درخت کے نیچے آرام کرنے والا شخص کون ہے؟ اس نے کہا کہ مکہ کے قریش کا ایک فرزند ہے۔ راہب نے کہا کہ

آج تک اس درخت کے نیچے حضرت عیسیٰؑ کے بعد کوئی دوسرا آدمی نہیں بیٹھا، یہ کوئی غیر معمولی آدمی نظر آتا ہے۔ پھر وہ حضور سے ملا اور گفت وشنید کی۔ راہب آپ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ بعض نشانیوں کو دیکھ کر اور حضورؐ کے عادات واطوار کو ملاحظہ کرنے کے بعد اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دقت نہ ہوئی کہ یہ نبی آخرالزماں ہیں۔ مگر یقینی بات کہنے کے لیے اس کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضورؐ اپنی تجارت سے فارغ ہوئے اور وطن لوٹے۔ چوں کہ میسرہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے، اس لیے وہ حضورؐ کے افعال وگفتار اور اخلاق وکردار سے بہت متاثر ہوے۔ اس کا ذکر انہوں نے حضرت خدیجہؓ سے کیا تو وہ بھی آپ کی قدرداں ہوگئیں۔ یہاں تک کہ حضرت خدیجہ نے آپ سے نکاح کی پیش کش کردی۔

ابن جریر طبری نے اس دوسرے سفر کے متعلق زیادہ تفصیلات بیان نہیں کی ہیں۔ انہوں نے بس اتنا لکھا ہے کہ میسرہ سے راہب نے پوچھا کون یہ شخص ہے۔ میسرہ نے مذکورہ باتیں بیان کردیں، اس پر راہب نے کہا کہ مانزل تحت هذه الشجره قط الانبی(۱۳) اس کے بعد انہوں نے تجارت سے واپسی اور مکہ پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔

ان واقعات کا کم زور پہلو

ان واقعات کے متعلق ایسی بہت سی باتیں بعض دوسری کتابوں میں جگہ پا گئیں ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض باتیں یہ ہیں۔ ایک یہ کہ قافلے والے حضورؐ کو سامان کی حفاظت کے لیے خیمہ میں چھوڑ کر راہب کی دعوت کھانے چلے گئے۔ لاکھوں کا سامان تجارت ایک بچہ کی نگرانی میں چھوڑ کر جانا خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جب حضرت ابوطالب سفر کے لیے نکل رہے تھے تو حضورؐ نے اپنے چچا کا دامن تھام لیا اور سفر میں ساتھ جانے پر اصرار کرتے رہے، بہ مشکل تمام ابوطالب اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوئے۔ جب قافلہ والوں کی دعوت راہب نے کی تو حضرت ابوطالب اپنے بھتیجہ کو غیر مامون جگہ پر تنہا چھوڑ کر ہرگز نہیں جاسکتے تھے، وہ آپ کو ضرور اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ راہب نے لات وعزی کی قسم دے کر حضورؐ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہا حضورؐ نے کہا، لات وعزی کی قسم مجھے نہ دو مجھے اس سے نفرت ہے۔ تب اس نے کہا کہ اچھا اللہ کے واسطے سے بتاؤ۔ پھر آپ نے راہب کے تمام سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ راہب نے آپ کی مہر نبوت کو ملاحظہ کیا اور پہچان لیا کہ آپ ہی نبی

آخرالزماں ہیں۔اس کا اظہار راہب نے ابوطالب سے کیا اور کہا کہ اس کی حفاظت کرنا، مبادا یہود پہچان لیں گے تو انہیں قتل کرڈالیں گے۔جیسے ہی ابوطالب نے بچہ کو وہاں سے رخصت کیا سات شرپسند رومی حضورؐ کو تلاش کرتے ہوئے خانقاہ میں پہنچ گئے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ ہم محمد کا قتل کرنے آئے ہیں۔مگر راہب کے سمجھانے پر وہ اپنے فعل سے باز آگئے۔یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں جو اس واقعہ کے متعلق بیان کی جاتی ہیں بے بنیاد اور من گھڑت معلوم ہوتی ہیں۔

اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۲؍سال کی عمر میں خود حضورؐ کو معلوم ہوگیا تھا کہ آپ عنقریب نبی بنائے جانے والے ہیں۔اسی طرح مکہ والے بھی جان گئے تھے کہ آپ ہی آخری نبی ہیں اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل جانی چاہیے تھی۔اگر راہب کی باتوں کا اعتبار کرلیا جائے تو کم ازکم اس سفر کے بعد لوگوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیوں نہیں کیا۔

اس سفر کے بعد آپ نے یقیناً کئی اسفار بغرض تجارت کیے ہوں گے جس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔لیکن بالکل اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ بغرض تجارت جاتے ہوئے بصری کے مقام پر ظاہر ہوا اور اس وقت بھی اسی خانقاہ کے ایک راہب جونسطورا کہلاتا تھا کا واسطہ آپ سے پڑا اور اس نے بھی آپ کے نبی بنائے جانے کی تصدیق کی۔یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اگر یہ سفر یقینی ہے تو آپ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا ہوگا اور راہب نے کہا ہوگا کہ حضرت عیسیٰ کے بعد سے لے کر آج تک کوئی دوسرا آدمی اس درخت کے نیچے نہیں بیٹھا۔مگر یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے نیچے بیٹھنے والا شخص ہی نبی آخرالزماں ہے۔علامہ زرقانی نے شرف المصطفی کے حوالے سے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ پھر نسطورا آپ کے قریب ہوا اور آپ کے قدم چومے اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول اور نبی امی ہیں، جس کی بشارت عیسیٰ نے دی تھی اور کہا تھا کہ میرے بعد اس درخت کے نیچے آپ کے سوا کوئی نہ بیٹھے گا۔(۱۴) واقعہ کی تفصیل میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ میسرہ نے پورے راستے میں آتے جاتے دیکھا کہ دو فرشتے مستقل آپ پر سایہ کیے رہتے ہیں۔یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔اگر ایسا ہوتا تو آپؐ خود تعجب کرتے اور قافلہ میں موجود لوگ حیرت میں پڑجاتے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

غیر معمولی باتوں کا اثر آپ ﷺ پر کیوں نہیں ہوا؟

اگر اس واقعہ میں صداقت ہوتی تو یہ بات مکہ سے لے کر شام تک اور شام سے لے کے مکہ

تک تو مشہور ہو ہی جاتی ،مگر روایات سے بس اتنا پتا چلتا ہے کہ میسرہ نے پورے راستہ اس منظر کو ملاحظہ کیا۔رہی بات راہب کے اس علامت کے ملاحظہ کرنے کی تو یہ کوئی بعید بات نہیں ہے، کیوں کہ بعض لوگ اپنے علم اور ریاضت کی وجہ سے بعض وقت اللہ کی نشانیوں کو ملاحظہ کر لیتے ہیں۔مگر پہلے تو یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہوا بھی کہ نہیں۔پھر جب حضورؐ تجارتی سفر سے لوٹ کر مکہ میں آئے تو خدیجہ نے اپنے بالاخانے سے دیکھا کہ حضور اونٹ پر سوار ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ کیے ہوئے ہیں اس منظر کو خدیجہ نے اپنی سہیلیوں کو دکھایا جو اس وقت موجود تھیں۔اس پر ان لوگوں کو تعجب ہوا۔میسرہ نے راستے کے عجائبات اور آپ کی کرامت و بزرگی کا تفصیل سے ذکر کیا اور راہب کی بات بیان کی کہ آپ نبی آخرالزماں ہیں جس کی بشارت کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔ان باتوں کو سننے اور آپ کی کرامت و بزرگی کو دیکھ کر حضرت خدیجہ نے اپنے آپ کو آپ سے منسوب کرنے کا پیغام بھیج دیا جسے آپ نے قبول بھی کر لیا۔(۱۵) اس طرح کی باتوں سے تو بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بار بھی آپ کو ۱۵/سال پہلے معلوم ہو گیا کہ آپ نبی بننے والے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آپ شروع سے ہی نیک ،شریف اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے،لیکن خود آپ پر اپنا مقصد زندگی واضح نہیں تھا اور نہ آپؐ نے مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے۔مگر بنیادی فرق یہ تھا کہ آپ کائنات کی ہر چیز پر غور وفکر کرتے تھے اور وحدانیت کے تصور سے آپ کا سینہ سرشار تھا۔اس لیے یہ بات کس طرح درست ہو سکتی ہے کہ جیسا کہ علامہ زرقانی اور حافظ ابن حجر نے ابوسعید کے حوالے سے کہا کہ راہب آپ پر ایمان لے آیا تھا۔(۱۶) نبوت ملی نہیں ایمان لانے کا عمل کیسے واقع ہو گیا۔

آیات قرآنی سے واقعہ کی تغلیط

مذکورہ دونوں اسفار میں راہب سے علمی استفادہ کو درست مانا جائے تو پھر قرآن کی مندرجہ ذیل آیتوں کا کیا جواب ہوگا،جس میں کہا گیا ہے کہ آپ نبوت کی امید لگائے ہرگز نہ بیٹھے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَى إِلَيْكَ الْكِتَاب." (القصص:۸۶)

(اور آپ ہرگز اس کے امیدوار نہ تھے کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی۔)

ایک اور مقام پر آپ کی امیت کو واضح کرنے کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ آپ کو کیا معلوم کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہوتی ہے، اگر اس بات کا پہلے سے علم ہوتا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں تو یہ بڑی بات ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"مَا كُنتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ." (الشوریٰ:۵۲)

(تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے)

آئندہ کے لیے اس طرح کی باتیں وہی شخص سوچ سکتا ہے جو سماج کا سب سے اعلیٰ فرد ہو۔ جیسا کہ کفار ومشرکین کی گفتگو قرآن نے نقل کی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو اور دوسرا معزز آدمی نہیں ملا تھا کہ وہ اسے نبی بناتا۔ (زخرف:۳۰) پھر دو مرتبہ جب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ عنقریب نبی بنائے جانے والے ہیں، تو آپ کے دل میں اس کی امنگ پیدا نہ ہوئی ناقابل فہم بات ہے۔ اگر ایسا ہوا تو نعوذ باللہ قرآن کی تصریحات غلط ہیں۔ یا پھر قرآن نے جو کچھ کہا ہے تو اسے ہی صحیح مانا جائے اور ماننا بھی چاہیے تو اس سفر میں جو خرق عادات باتیں سامنے آتی ہیں وہ لغو ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> "یہ واقعہ جس پر مستشرقین نے بہت سے قیاسات کی عمارت اٹھائی ہے اور ان علوم کو جو رسول ہونے کے بعد آپ سے ظاہر ہوئے، عیسائی راہبوں سے حاصل کردہ معلومات قرار دیا ہے۔ اس پر مزید خود ہمارے ہاں کی بعض روایات بھی ایسی ہیں جو ایک حد تک ان قیاسات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ایک زاہد مرتاض آدمی جس نے مجاہدوں سے اپنی روحانی قوتوں کو نشوونما دیا ہو، کچھ غیر معمولی برکات کے آثار دیکھ کر محسوس کرلے کہ اس قافلہ میں کوئی عظیم شخصیت موجود ہے، اور آپ کو دیکھ کر اسے اپنے اندازوں کی تصدیق ہوگئی ہو۔ نیز اس نے اس خیال سے کہ یہودی ایک حاسد قوم ہیں اور وہ عرب کے امیوں میں کسی عظیم شخصیت کے ظہور کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر اس کے درپے آزار ہوسکتے ہیں، ابوطالب کو ان سے بچانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ آپ ہی وہ ہونے والے نبی ہیں جن کے آنے کی خبر پچھلی کتابوں میں دی گئی ہے، کیوں کہ پیشین گوئیوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ان کا نام محمد ہوگا، لیکن تعیین کے ساتھ یہ معلوم

کر لینا ممکن نہ تھا کہ حضور ہی وہ نبی ہیں''۔(۱۷)

اسی واقعہ کے تناظر میں شیخ محمد غزالی لکھتے ہیں:

''خواہ یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، لیکن بعد میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ نہ حضرت محمدؐ نے نبوت کی توقع یا اس کے لیے تیاری شروع کی، نہ اہل قافلہ نے بعد میں اس واقعہ کو پھیلایا اور اس طرح بھول گئے جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔''(۱۸)

علماء ومحدثین کے نزدیک تجارتی اسفار اور حدیث کی حقیقت

محدثین کی بیان کردہ روایات میں دیگر باتوں کے ساتھ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ بحیرا راہب کے کہنے پر ابوطالب نے اپنے بھتیجے کو حضرت ابوبکر اور حضرت بلال کی معرفت مکہ روانہ کر دیا۔ اس وقت حضرت ابوبکر خود چھوٹے تھے اور حضرت بلال کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس بنا پر علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ باطل ہے۔ علامہ مبارک پوری تحریر کرتے ہیں علامہ ذہبی نے حدیث کے مذکورہ جملے کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے، کیوں کہ ابوبکر نے بلال کو اس وقت خریدا بھی نہ تھا۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک بلال کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا تو اس وقت تک ابوبکر یا ابوطالب کے ساتھ نہیں تھے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ترمذی، حاکم، بیہقی اور ابن عساکر نے بیان کیا ہے اس میں بعض عجیب باتیں ہیں، یہ مرسلات صحابہ میں سے ہے اس لیے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری جو اس کے راوی ہیں غزوہ خیبر کے سال تشریف لائے تھے۔ اصطلاحات حدیث کی رو سے یہ حدیث معلل ہے۔(۱۹) اس کے برعکس حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ اس میں اس جملے کے علاوہ کوئی نقص نہیں۔ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ جملہ مدرج ہو۔ یعنی کسی دوسری منقطع روایت سے اس میں شامل ہو گیا ہو اور یہ کسی راوی کا وہم ہو۔ جب کہ علامہ شبلی نعمانی حافظ ابن حجر پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چوں کہ حضرت ابوبکر اور بلال کی شرکت بداہتاً غلط ہے، اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمٰن بن غزوان کی

نسبت خود ہی حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ ''وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے'' ممالیک کی ایک روایت ہے ،جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔''(۲۰)

واقعات میں جو خامی ہے اس کے علاوہ بھی اس روایت میں سند کے اعتبار سے کم زوری ہے، اس کی صراحت کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اس حدیث کے آخیر راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے ۔ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ سند مذکور ہے (وہ مرسل یا معضل ہے۔یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے، اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)''(۲۱)

ان کے علاوہ اس حدیث میں جو مزید خامیاں ہیں اس پر علامہ شبلی نے سخت کلام کیا ہے ،جس کی رو سے یہ حدیث قابل توجہ نہیں رہتی ۔اس صورت میں سفر شام میں راہب کی ملاقات اور اس کی نشان دہی بہ سلسلہ نبوت مشکوک ہوکر رہ جاتی ہے ۔ترمذی کی مذکورہ روایت میں کئی اعتبار سے سقم پایا جاتا ہے ۔اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو عقل وفہم کے خلاف نظر آتی ہیں۔نیز اس میں واقعہ کے تسلسل اور ترتیب کا فقدان ہے۔اس لئے بیش تر علماء نے اس روایت پر اعتماد نہیں کیا ہے۔شیخ محمد الغزالی لکھتے ہیں:

''محققین کے نزدیک یہ روایت موضوع ہے، اس میں اس واقعہ سے مشابہت ہے جسے اہل انجیل بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے فورا بعد کچھ لوگ انہیں قتل کرنے کے لیے تلاش کررہے تھے اور عیسائیوں کے یہاں پایا جانے والا یہ واقعہ اس واقعہ سے مشابہت رکھتا ہے جسے بدھ مت کے پیروکار بیان کرتے ہیں کہ گوتم بدھ کی جب ولادت ہوئی تو دشمنوں نے انہیں قتل کرنے کے لیے تلاش کیا۔''(۲۲)

اس طرح کی روایات کو قبول کیوں نہیں کیا جانا چاہئے ،اس کی وجہ بتاتے ہوئے شیخ غزالی یہ بھی تحریر کرتے ہیں:

''علمائے سنت روایات کی تحقیق متن اور سند دونوں پہلوؤں سے کرتے ہیں۔ اگر ان سے پختہ علم اور ظن غالب حاصل نہ ہو تو ان کی پرواہ نہیں کرتے ،پیغمبروں کی جانب بہت سی خرافات منسوب کردی گئی ہیں، اگر انہیں فن حدیث کے مقررہ قواعد کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان کا کھوٹ ظاہر ہوتا ہے اور ان کی بنا پر انہیں رد کرنا مناسب ہوتا ہے۔'' (۲۳)

اس حدیث کے الفاظ سے کسی سے مشابہت ہو یا نہ ہو، زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ بحث اس سے ہے کہ کیا چھوٹی عمر میں خود حضورؐ کو اپنے بارے میں اور اہل مکہ کو آپ کے نبی ہونے کا علم ہو چکا؟ اگر ہوا تو یہ معمولی بات نہیں تھی ،اس کی تیاری پہلے سے شروع ہوجانی چاہیے تھی اور پھر چالیس سال کے بعد نبیؐ کی مخالفت کا جو بازار گرم ہوا وہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ اہل مکہ کو دوسروں کی زبانی پہلے ہی آپ کی نبوت کا علم ہو چکا تھا اور آئندہ چل کر نبیؐ کے ذریعہ کون کون سے کام انجام پائیں گے اس کی بھی وضاحت ہوگئی تھی ،تو پھر حضورؐ نے جس چیز کی دعوت دی اس کی مخالفت کرنے کے بجائے قبول کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس واقعہ کو صحیح سمجھ لیا جائے جیسا کہ کچھ لوگوں نے صحیح سمجھا ہے تو مستشرقین کے اس اعتراض کا کیا جواب ہوگا جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کے ذہن میں توحید پرستی اور واحد مطلق ہستی کی طرف میلان کا جو رجحان پیدا ہوا وہ اسی راہب کی تعلیم کا نتیجہ ہے، اور حضورؐ پہلے سے ہی نبوت کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ کیا اس قسم کی باتیں حضورؐ کی سیرت اور نبوت کے منافی نہیں ہیں۔ اس قسم کی روایت کی عدم صحت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی لکھتے ہیں:

''سیرت ابن ہشام (۱۸۰/۱) باختصار، اس روایت کو طبری نے اپنی تاریخ (۲۸۷/۲) میں، بیہقی نے سنن میں اور ابونعیم نے حلیہ میں روایت کیا ہے، ان کی تفصیل میں بعض وجوہ سے کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس روایت کو امام ترمذی نے دوسرے انداز سے تفصیل سے نقل کیا ہے، لیکن شاید ان کی سند میں کچھ ضعف ہے۔ اسی لیے انہوں نے خود بھی لکھا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، اس کے بارے میں 'المیزان' میں صراحت ہے کہ اس سے بعض منکر احادیث مروی ہیں۔ ان میں سب سے منکر حدیث وہ ہے جو اس نے یونس بن اسحاق سے روایت کی ہے

اور جس میں نبیؐ کی نوعمری میں ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر کا بیان ہے اور ابن سیدالناس نے لکھا ہے کہ اس روایت کے متن میں بعض منکر باتیں ہیں۔ (دیکھئے عیون الاثر ۱/۴۳) عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود شیخ ناصرالدین البانی نے (جنہوں نے شیخ محمد غزالی کی کتاب فقہ السیرۃ کی تخریج کی ہے) اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے: اس کی سند صحیح ہے۔ انہوں نے امام ترمذی کا تبصرہ بھی مکمل نقل نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا صرف اتنا حصہ دیا ہے ''یہ حدیث حسن ہے'' حالاں کہ ان کی عادت ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ صحیح حدیث کو بھی بسا اوقات ضعیف قرار دیدیتے ہیں۔ جہاں تک قدر مشترک کا تعلق ہے وہ بہت سے طرق سے ثابت ہے اور اس میں کوئی ضعف نہیں ہے۔'' (۲۴)

مستشرقین کے دعویٰ کی کمزوری

روایتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ آپ نے متعدد اسفار تجارت کی غرض سے کئے۔ انہیں اسفار میں آپ کی ملاقات اہل کتاب کے عالموں سے ہوئی۔ جہاں تک ان کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے علمی و روحانی استفادہ کی بات ہے، ناقابل تسلیم ہے۔ اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا آپؐ نے اسی بات کی تعلیم دی جسے آپؐ نے راہبوں سے سیکھا تھا تو پھر اس پر عیسائی عمل کیوں نہیں کرتے اور اس کی تکذیب کیوں کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ نبی برحق نہیں تھے اور آپ نعوذ باللہ عیوب کا مجموعہ ہیں۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

''پادری صاحبان نے اتنی بات پر ''بحیرا نصرانی ملا تھا'' یہ شاخ و برگ اور بھی لگادئے کہ ۴۰ سال کی عمر کے بعد جو تعلیم آں حضرتؐ نے ظاہر کی تھی، وہ اس راہب کی تعلیم کا اثر تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آں حضرتؐ نے تثلیث اور کفارہ کا رد، مسیح کے صلیب پر جان دینے کا بطلان اس راہب کی تعلیم ہی سے کیا تھا تو اب عیسائی اپنے اس بزرگ کی تعلیم کو قبول کیوں نہیں کرتے۔'' (۲۵)

خاص طور پر یہودی آخری نبی کی آمد کے منتظر تھے۔ تاکہ ان کی رہنمائی اور تعاون سے ان عیسائیوں کو جن کے ظلم کی چکی میں وہ برسوں سے پس رہے تھے، کیفر کردار تک پہنچا سکیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جب ۱۲ر سالہ بچے کو بحیرا کے کہنے پر واپس مکہ بھیج دیا گیا تو ٹھیک انہی دنوں ے

رومی حضور کو تلاش کرتے ہوئے بحیرا کی خانقاہ میں پہنچے تا کہ نبی آخرالزماں کا قتل کردیں۔مگر انہوں نے ان کو نہ پایا اور راہب نے بھی ان لوگوں سے کہا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے، کیوں کہ اللہ کا یہی فیصلہ ہے۔اس کے بعد وہ اپنے ارادے سے پھر گئے۔اب قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

"وَكَانُواْ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُواْ فَلَمَّا جَاءهُم مَّا عَرَفُواْ كَفَرُواْ بِهِ." (البقرہ:۸۹)

(باوجود کہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح ونصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے،مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔)

اس آیت کے حوالے سے قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ:

''اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ بحیرا راہب کا قول غلط تھا، کیوں کہ یہودی لڑکپن میں آں حضرت کو پہچان لیتے تو اپنے اعتقاد کے مطابق حضورؐ کو اپنی فتح ونصرت کا دیوتا سمجھ کر، نہایت خدمت گزاری کرتے''۔(۲۵)

پہلی بار جب آپ نے شام کا سفر کیا، اس وقت آپ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۲؍سال کی تھی۔ (بعض روایت کے مطابق اس وقت آپ ۹؍سال کے تھے۔) اتنی چھوٹی عمر میں ایک راہب سے علم وحکمت کی وہ ساری باتیں کیسے سیکھ لیں جن کا روئے زمین میں کوئی ثانی نہیں۔وہ بھی چند منٹوں یا گھنٹوں کی ملاقات میں۔اس لیے مستشرقین کے یہ اعتراضات بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں کہ آپ نے راہبوں سے علمی فیض حاصل کیا تھا۔جب کہ قرآن اور سابقہ کتابیں بار بار کہتی ہیں کہ آپ امی تھے۔یہی نہیں بلکہ بعض مستشرقین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرآن کا اصل مصنف بحیرا ہے جس سے حضورؐ نے اخذ کیا ہے۔چنانچہ اس ذہنی خرافات کے متعلق ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں:

''کیا یہ معجزہ رونما ہوسکتا ہے کہ نو سال کی عمر کا ایک بچہ قرآن پاک کی ۱۱۴؍سورتیں چند منٹ میں حفظ کرلے اور پھر ایک نسل کے بعد ان قرآنی سورتوں کو یہ کہہ کر اپنی امت کے روبرو پیش کرے کہ یہ اللہ کا کلام ہے؟''۔(۲۷)

شام کے سفر سے متعلق جو رطب ویابس باتیں روایات میں داخل ہوگئیں ہیں ان کی تردید کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں کہ کسی غیبی آثار کو دیکھ کر راہب نے قافلہ والوں کی دعوت

نہیں کی تھی بلکہ ان کے اچھے رویے اور برتاؤ سے متاثر ہوکر راہب نے کھانے پر مدعو کیا تھا۔اس کے بعد وہ اپنے شبہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ''شاید وہ مذہب کی تبدیلی کے حوالے سے نیک ارادہ رکھتا ہو۔''(۲۸)

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک وشبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔اگر یہ صحیح ہے تو دنیا کے لیے اس سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ کا اور کیا چاہیے کہ ایک ابجد نا آشنا طفل دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق واسرار دین،اصول عقائد،نکات اخلاق،مہمات قانون اور ایک شریعت عظمی کی تکمیل وتاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لیے۔کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں۔''(۲۹)

حاصل بحث

مستشرقین نے حصول علم اور معلومات کے ذرائع جن نصرانی عالموں کو قرار دیا ہے۔ورقہ بن نوفل بھی انہی میں سے ایک تھے جو مکہ میں رہتے تھے۔اگر بحیرا راہب سے حضور کے تعلیمی سلسلہ کو جوڑا جاتا ہے تو ورقہ کو خاص طور پر اس بات کا علم ہوتا کہ آپ نبی برحق ہیں،کیوں کہ وہ آپ کو حضرت خدیجہ سے شادی سے قبل سے ہی جانتے تھے۔پھر خدیجہ سے رشتہ داری کی بنا پر ان سے بڑی حد تک قربت ہوگئی،لیکن جب حضورؐ پر پہلی وحی کے نازل ہونے کے وقت جو کیفیت طاری ہوئی،اسے خدیجہؓ کی وساطت سے ورقہ کے سامنے بیان کیا گیا۔جسے سننے کے بعد انہوں نے کہا آپ نبی برحق ہیں اور یہ وہی ناموس ہے جو موسی پر وحی لایا کرتا تھا۔ورقہ نے اپنی سابقہ آسمانی کتابوں کی روشنی میں آپ کے نبی ہونے کی تصدیق کی نہ کہ خبروں کو سن کر۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ورقہ کو دونوں آسمانی کتابوں کا علم تھا۔پہلے وہ یہودی تھے،بعد میں عیسائی ہوگئے تھے اور یہ عربی اور عبرانی زبان میں انجیل لکھتے تھے۔ان کتابوں کا گہرا علم رکھنے کے باوجود حضورؐ کی علامات وکیفیات کو سن کر اگر وہ اس کے خلاف کوئی دوسری بات کہتے تو گویا کہ وہ ایک حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضورؐ نے علمی فیض حاصل کیا۔

رہے بعض دوسرے اہل کتاب علماء ورہبین ان سے آپ کی ملاقات برائے نام تھی اور خود حضورؐ اتنے اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے کہ اپنے شدید دشمن سے بھی ملتے تو خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتے۔ اسی طرح اہل کتاب کے بعض عالموں سے چاہے وہ غلام ہی کیوں نہ ہوں ملاقات ہوجاتی تو ان کی عظمت کا بھی آپؐ پورا خیال کرتے تھے۔لہذا یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ شروع سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ خصوصی نہج پر آپ کی تربیت کررہا تھا اور آلائشوں سے آپ کے قلب ونظر اور فکر وخیال کو مصفی کردیا تھا،اس لیے باطل افکار کے جذب کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر جب آپؐ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو گوآپ امی تھے،مگر آپ کو جو معلومات حاصل ہورہی تھیں وہ بواسطہ وحی ہورہی تھیں جسے فرشتہ وحی لے کر آتا اور بعض وقت براہ راست آپ کے قلب اطہر میں کوئی بات ڈال دی جاتی تھی۔جب یہ صورت ہوتو لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک امی پر ہی نبوت کے سلسلہ کو ختم کردیا تاکہ دنیا یہ تسلیم کرلے کہ اللہ کی قدرت دنیا کی ساری چیزوں پر محیط ہے اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا وہ سب اسی کے ایما اور اشارے سے ہوگا۔رہے آپ کے بعض رفیق جو پہلے عیسائی تھے اور بعد میں مسلمان ہوگئے یا آپ کا اپنی زوجہ مطہرہ ماریہ قبطیہ سے علم حاصل کرنا محض الزام اور تعصب ہے۔ان میں کوئی اس لائق نہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کو علمی فیض پہنچا سکے۔

❁ ❁ ❁

مآخذ ومراجع

(۱) شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ندوۃ المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ج:۱،ص:۱۲۶

(۲) ڈاکٹر التہامی نقرہ، مستشرقین اور قرآن، (عربی اسلامی علوم اور مستشرقین (مجموعہ مقالات عربی) مترجم: ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی) توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ، کشن گنج، بہار، ۲۰۰۴ء، ص:۱۲،

(۳) ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی

(۴) ایضا، کتاب المناقب، باب عمرۃ القضا

(۵) سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، ندوۃ المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ج:۳،ص:

(۶) سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ج:۱،ص:۴۲۵ اور ص:۶۵۰

(۷) سیرۃ النبی، ج:۳،ص:۳۶۲

(۸) محمد بن عیسیٰ الترمذی، جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی بدء نبوۃ النبی

(۹) محمد بن اسحاق بن یسار، سیرت ابن اسحاق، ملی پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص:۸۶

(۱۰) ابوالفد ا ر اسماعیل بن کثیر، البدایہ والنہایۃ، دارالریان للتراث، قاہرہ، ۱۹۸۸ر، ج:۱، جزو:۲، ص:۲۶۳-۲۶۴
(۱۱) ابی جعفر محمد بن جریر الطبر ی، تاریخ طبری (تاریخ الرسل والملوک) دارالمعارف، قاہرہ، ۱۹۷۷ء ، ج:۲، ص:۲۷۸-۲۷۹۔
(۱۲) ایضا، ص:۲۸۰
(۱۳) محمد بن الباقی الزرقانی، شرح مواہب اللد نیہ، مطبعۃ الازہریۃ، مصر، ۱۳۲۵ھ، ج:۱، ص:۱۹۵
(۱۴) سیرت ابن اسحاق، ص:۶۸
(۱۵) شرح مواہب اللد نیہ، ص:۱۹۵
(۱۶) سیرت سرور عالم، ج:۲، ص:۸۵
(۱۷) شیخ محمد الغزالی، فقہ السیر ۃ، مطبعۃ حسان، قاہرہ، ۱۹۷۶ر، ص:۶۸
(۱۸) ایضا، ص:۶۹
(۱۹) سیرۃ النبی، ج:۱، ص:۱۲۸
(۲۰) ا ایضا
(۲۱) فقہ السیر ۃ، ص:۶۹
(۲۲) ایضا
(۲۳) ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیر ۃ النبویۃ، دارالفکر المعاصر، بیروت لبنان، ۱۹۹۱ر، ص:۴۸
(۲۴) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، فرید بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۹ر، ج:۱، ص:۴۲
(۲۵) ایضا
(۲۶) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۳ر، ص:۱۴-۱۵
(۲۷) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، پیغمبر اسلام، ملی پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ر، ص:۵۹-۶۰
(۲۸) سیرۃ النبی، ج:۳، ص:۳۶۲

❁ ❁ ❁

==========

ضروری اعلان

ماہنامہ دارالعلوم کے خریدار حضرات سے گذارش ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کی خریداری کیلئے رقم ارسال کرتے وقت اِس کی صراحت ضرور کردیا کریں کہ یہ رقم بمد رسالہ ہے نیز اِس کے ساتھ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے دفتر کو بھی بذریعہ خط مطلع فرمائیں کہ کس تاریخ میں اور کس قدر رقم ماہنامہ کیلئے ارسال کی گئی ہے اور قدیم خریدارانِ ماہنامہ خریداری نمبر بھی ضرور تحریر فرمائیں۔

مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

انکارِحدیث کیوں؟

از: مولانا محمد یوسف لدھیانوی

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ .

امابعد!

مذہب اسلام کیلئے موجودہ دور میں جوسوالات خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان میں حدیث نبوی (علی صاحبہا الف الف سلام) کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات بالخصوص توجہ طلب ہیں۔

۱- حدیث کا مرتبہ اسلام میں کیا ہے؟

۲- حدیث سے شریعت اسلامیہ کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟

۳- حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے تو اس سے دین کو کیا نقصان ہوگا، دور حاضر میں انکار حدیث کی جو وبا، پھوٹ پڑی ہے، یہ کن جراثیم کا نتیجہ ہے؟

سطور ذیل میں ہم ان سوالات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔

و اللّٰہ الموفق و المعین.

لیکن اصل سوالات پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم چند اصولی امور ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں جن سے نظر وفکر کی مزید راہیں کھل سکیں۔

۱- نبی امت کی عدالت میں

انکار حدیث کا فتنہ ظہور میں آچکا ہے۔ بحث کرنے والے پوری قوت کے ساتھ اس بحث میں مصروف ہیں کہ حدیث حجت ہے یا نہیں؟ جن لوگوں کی طرف سے یہ بحث اٹھائی گئی ہے ان کا حال تو انہی کو معلوم ہوگا لیکن جہاں تک میرے ایمان کا احساس ہے یہ سوال ہی غیرت ایمانی کے خلاف چیلنج ہے جس سے اہل ایمان کی گردن ندامت کی وجہ سے جھک جانی چاہئے۔

اس فتنہ کے اٹھانے والے ظالموں نے نہیں سوچا کہ وہ اس سوال کے ذریعہ نبی اکرم ﷺ کی

ذات کو اعتماد یا عدم اعتماد کا فیصلہ طلب کرنے کے لئے امت کی عدالت میں لے آئیں گے۔ امت اگر یہ فیصلہ کردے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات (حدیث) قابل اعتماد ہے، تو اس کے مرتبہ کا سوال ہوگا اور اگر نالائق امتی یہ فیصلہ صادر کردیں کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات (حدیث) آپ کے زمانہ والوں کے لئے لائق اعتماد ہو تو ہو لیکن موجودہ دور کے متمدن اور ترقی پسند افراد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرنا ملائیت ہے'' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ ہوجائے گا۔ (معاذ اللہ، استغفر اللہ) اگر دل کے کسی گوشے میں ایمان کی کوئی رمق بھی موجود ہے تو کیا یہ سوال ہی موجب ندامت نہیں کہ نبی ﷺ کی بات لائق اعتماد ہے یا نہیں؟

تُف ہے! اس مہذب دنیا پر کہ جس ملک کی قومی اسمبلی میں صدر مملکت کی ذات کو تو زیر بحث نہیں لیا جاسکتا (پاکستان کی قومی اسمبلی کے اسپیکر نے متعدد دفعہ یہ رولنگ دی ہے کہ معزز ارکان اسمبلی صدر مملکت کی ذات گرامی کو زیر بحث نہیں لاسکتے) لیکن اسی ملک میں چند ننگ امت، آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کو نہ صرف یہ کہ زیر بحث لاتے ہیں بلکہ زبان وقلم کی تمام تر طاقت اس پر صرف کرتے ہیں کہ امت رسول اللہ ﷺ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دے ڈالے۔ اگر ایمان اسی کا نام ہے تو مجھے کہنا ہوگا، ﴿بئسَمَا يَأمُرُكُم بِهِ إيمانكم إنْ كُنتُم مُؤمِنِين﴾۔

بہرحال مریض دلوں کے لئے انکار حدیث کی خوراک لذیذ ہو تو ہو (غلبہ صفراء کی وجہ سے ان مسکینوں کو اس کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا) لیکن میرے جیسے گنہگار اور ناکارہ امتی کے لئے یہ موضوع خوشگوار نہیں بلکہ یہ بحث ہی تلخ ہے، نہایت تلخ، مجھے کل ان کے دربار میں جانا ہے اور ان کی شفاعت کی امید ہی سرمایہ زندگی ہے۔ سوچتا ہوں اور خدا کی قسم، کانپتا ہوں، کہ اگر ان کی طرف سے دریافت کرلیا گیا کہ ''او نالائق! کیا میری حدیث کا اعتماد بھی محل بحث ہوسکتا ہے؟ تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ اسلام کے ان فرزندان ناخلف نے خود رسالت مآب ﷺ پر جرح وتعدیل کا جو راستہ اختیار کیا ہے واللہ! اس میں کفر ونفاق کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (اب جس کا جی چاہے نبی کی بات پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کا

(۱) یہ حدیث بہت سی کتب حدیث میں بایں الفاظ مروی ہے:

عن المقدام بن معدی کرب الکندی، اَنّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حرّم اشیاء یوم خیبر: الحمارَ وغیرہ ثم قال: یوشك الرجل متکئاً علی اریکتہ یُحدَّث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللّٰہ ما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ وما وجدنا فیہ من حرام حرمناہ، الا وان ما حرّم رسول اللّٰہ فھو مثل ما حرّم اللّٰہ (سنن الدارمی باب السنۃ قاضیۃ علی کتاب اللّٰہ ج:۱، ص:۱۵۲)

راستہ اختیار کرے)

۲-فتنہ کی شدت

فتنہ کی کجی ملاحظہ کیجئے۔ دین قیم کے وہ صاف، واضح، روشن اور قطعی مسائل جن میں کل تک شک وتردد کا ادنیٰ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا؛ کل تک ملت اسلامیہ جن کو یقینی مانتی چلی آئی تھی، شکی مزاج طبیعتیں آج ان ہی مسائل کو غلط اور ناقابل قبول ٹھہراتی ہیں۔

ایک رسول اکرم ﷺ کی ذات اب تک محفوظ تھی، تمام امت کا مرجع تھی، ہر امتی آنحضرت ﷺ کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کردیا کرتا تھا۔ امت میں کوئی اختلاف رونما ہو، اس کے فیصلہ کے لئے آپ کی ذات آخری عدالت تھی اور آپ کا ہر فیصلہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن افسوس! آج کس کے پاس یہ شکایت لے جائیں کہ فتنہ کے سیلاب کی موجیں علماء، صلحاء، صوفیاء، متکلمین، محدثین، مجتہدین، تابعین اور صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) ان سب کو روندتی ہوئی دین وشریعت کی آخری فیصل ذات رسالت مآب ﷺ سے ٹکرا رہی ہیں اور چاہا جاتا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی اور سب سے آخری عدالت کو بھی مجروح کردیا جائے فالی الله المشتکی.

اف! مبتلائے فتنہ امت میں یہ بحث موضوع سخن ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی حدیث حجت ہے یا نہیں، دینی حیثیت سے قابل قبول ہے یا نہیں؟ کیا یہ صاف اور موٹی بات بھی کسی کی عقل میں نہیں آسکتی کہ کسی ذات کو نبی اور رسول ماننا یا نہ ماننا تو ایک الگ بحث ہے۔ لیکن جس ذات کو رسول مان لیا جائے، ماننے والے کے ذمہ اس کی ہر بات کا مان لینا بھی ضروری ہے، جس کام کا وہ حکم کرے اس کی تعمیل بھی ماننے والے کے لیے لازم ہے اور جس فعل سے وہ منع کرے اس سے رک جانا ضروری ہے۔

> رسول کو رسول مان کر اس کے احکام میں تفتیش کرنا کہ یہ ''حکم آپ اپنی طرف سے دے رہے ہیں یا خدا کی طرف سے؟ اور اگر آپ اپنی طرف سے کوئی ارشاد فرماتے ہیں تو اس کی تعمیل سے معاف رکھا جائے'' نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کتنی صاف اور سیدھی بات تھی لیکن نہیں معلوم لوگ عقل کو کہاں استعمال کیا کرتے ہیں کہ ایسے بدیہی امور میں بھی شک اور تردد کا مرض ان کو ایمان ویقین سے محروم کئے رکھتا ہے۔
>
> شرح تحریر میں ہے۔
>
> ''حجية السنة سواءٌ كانت مفيدة للفرض او الواجب أو غيرهما (ضرورةٌ

دینیةٌ) کل من له عقل وتمیز حتی النساء والصبیان یعرف أن من ثبت نبوته صادق فیما یخبر عن اللّٰہ تعالی ویجب اتباعه" (تیسیر التحریر ص:۲۲ ج۳)

ترجمہ: سنت خواہ مفید فرض ہو یا واجب یا ان کے علاوہ کے لئے مفید ہو، اس کا حجت ہونا دین کا ایسا واضح مسئلہ ہے جس میں طلب دلیل کی ضرورنہیں، جس کو ذرا بھی عقل وتمیز ہو، عورتوں اور بچوں تک بھی، وہ جانتا ہے کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بتلائے گا اس میں قطعاً سچا ہوگا اور اس کی بات کی پیروی واجب ہوگی۔''

منکرین حدیث کی کور چشمی ملاحظہ کرو۔ اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ رسول برحق ہیں اس پر بھی اتفاق ہے کہ علم وعرفان کے سرچشمہ ہوتے ہیں الغرض آفتاب طلوع ہوچکنے کے بعد، بحث اس پر ہورہی ہے کہ سورج نکلنے کے بعد دن ہوتا ہے، یا رات ہوتی ہے۔ زبان وقلم، عقل وفہم اور دل ودماغ کی قوتیں اس پر صرف کی جارہی ہیں کہ رسول کو رسول ماننے کے بعد اس کی کسی بات (حدیث) پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو خیرہ چشم طلوع آفتاب کا اقرار کرنے کے باوجود ''دن نہیں رات'' کی رٹ لگارہا ہو اور چاہتا ہو کہ تمام دنیا اسی کی طرح آنکھیں موندلے، بتلایا جائے کہ آپ ایسے سوفسطائی کو کس دلیل سے سمجھا سکتے ہیں۔

اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کا زبانی اقرار کرنے والوں سے جب سنا جاتا ہے کہ جس ذات کو ہم رسول مانتے ہیں اسی کا کوئی قول اور فعل ہمارے لئے حجت نہیں تو بتلایئے ایسے محرومان بصیرت کے لئے کونسا سامان ہدایت سودمند ہوسکتا ہے؟ کاش ان کو چشم بصیرت نصیب ہوجاتی۔ ﴿فَإِنَّهَا لا تَعْمَى الأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوب الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ ''کیونکہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں، بلکہ وہ دل اندھے ہوچکے ہیں جو ان کے سینوں میں ہیں۔''

۳-منکرین حدیث کی بے اصولی

حدیث کا جو ذخیرہ اس وقت امت کے پاس محفوظ ہے اس کے دو جز ہیں۔

(۱) متن (۲) سند۔ یعنی ایک تو حدیث کے وہ جملے ہیں جو قولاً یا فعلاً یا تقریراً صاحب حدیث ﷺ کی طرف منسوب ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا یا آپ نے فلاں عمل کرکے دکھایا یا آپ نے فلاں کام کی... جو آپ کے سامنے کیا گیا، تصویب فرمائی۔ دوم اساتذہ حدیث کا وہ سلسلہ ہے جو امت اور امت کے نبی ﷺ کے درمیان واسطہ ہیں۔ مثلاً امام بخاری جس حدیث کو روایت

کریں گے وہ ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے جائیں گے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث کن کن واسطوں سے ہم تک پہنچی۔

پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی حدیث جن لوگوں نے خود آپ ﷺ کی زبان فیض ترجمان سے سنی وہ سننے والوں کے حق میں اسی طرح قطعی تھی جس طرح قرآن کریم قطعی ہے۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو حکم بھی صادر ہوا بالمشافہ سننے والوں کے لئے اس کا درجہ وحی خداوندی کا ہے اگر آپ نے اس کو قرآن میں لکھنے کا حکم دیا تو وہ وحی جلی کہلائے گا ورنہ وحی خفی۔

قسم اوّل (وحی جلی) کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ تھے۔

قسم دوم (وحی خفی) کا مضمون منجانب اللہ ہوتا تھا، الفاظ آنحضرت ﷺ کے ہوتے تھے، بہرحال وحی کی یہ دونوں قسمیں چونکہ منجانب اللہ ہیں اس لئے دونوں پر ایمان لانا اور دونوں کا قبول کرنا اہل ایمان کے ذمہ ضروری ہوا۔ البتہ روایت حدیث کے اعتبار سے حدیث کی مختلف قسمیں ہوجاتی ہیں جن کی تفصیل کو مع ان کے احکام کے اپنی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

اب منکرین حدیث کی بے اصولی دیکھئے کہ وہ ان دونوں اجزاء (متن حدیث اور سند حدیث) کے متعلق مخلوط بحث کریں گے۔ حالانکہ بے اعتمادی کا زہر پھیلانے سے پہلے انصاف ودیانت کا تقاضا یہ تھا کہ محل بحث کو طے کرلیا جاتا کہ کیا ان کو نفس حدیث ہی پر اعتماد نہیں خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو؟ یا نفس حدیث پر ان کو اعتماد ہے اور وہ اسے دینی سند بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن موجودہ ذخیرہ حدیث کے متعلق ان کی بے اعتمادی کا سبب یہ ہے کہ پوری امت میں ان کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس نے آنحضرت ﷺ کی یہ امانت امت تک صحیح پہنچادی ہو اس لئے اس کو موجودہ ذخیرہ حدیث سے ضد ہے۔ مثلاً امام مالک کی وہ روایت جو مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مروی ہیں، جو شخص ان روایات پر بے اعتمادی کا اظہار کرتا ہے، کیا اس کا فرض نہ ہوگا کہ وہ اپنی بداعتمادی کی وجہ بتلائے کہ آیا اسے حدیث کے ان تین ناقلین، مالک، نافع، ابن عمر رضی اللہ عنہم پر ہی اعتماد نہیں۔ معاذ اللہ۔ یا خود ذات رسالت مآب ﷺ پر اعتماد نہیں۔ استغفر اللہ۔

بہرحال جب تک موضوع کی تنقیح اور تعین نہ کرلی جائے، اس وقت تک کسی بھی مسئلہ پر بحث لغو اور لایعنی مشغلہ ہے۔ لیکن آپ منکرین حدیث کو پائیں گے کہ وہ کبھی نفس حدیث پر بحث کریں گے کہ محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں اور کبھی بے چارے ناقلین حدیث پر تبرا شروع کردیں گے کہ ان لوگوں نے اُمت کی یہ امانت بعد میں آنے والی

امت تک کیوں پہنچائی۔لیکن انکار حدیث کا منشا متعین کرنے سے وہ گریز کریں گے۔اس لئے میں کہوں گا کہ حدیث پر سے اعتماد اٹھانے کا اصل حل تلاش کرو اور محل بحث تلاش کرنے کے بعد افہام وتفہیم کریں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ قصور وار ناقلین روایت ہوں اور فرد جرم خود حدیث پر عائد کردی جائے۔ یا اعتماد نفس حدیث پر نہ ہو، اور اس کی سزا حدیث روایت کرنے والی پوری امت کو دی جانے لگے۔

۴-انکار حدیث کا عبرتناک انجام

حدیث پر اعتماد نہ کرنے والوں کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ذات نبوی ﷺ یا پوری امت میں سے ایک کو ناقابل اعتماد قرار دینا ہوگا استغفر اللہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ زید کا کلام عمرو نقل کرے، سننے والے کو زید کے صدق کا یقین ہو اور عمرو پر اعتماد ہو کہ وہ نقل میں جھوٹا نہیں لیکن اس کے باوجود کہے، کہ یہ کلام جھوٹا ہے۔ بہرحال یہاں یہ سوال کسی خاص حدیث کا نہیں بلکہ مطلق حدیث کا ہے۔ جب اس کا انکار کیا جائے گا اور اسے ناقابل اعتماد قرار دیا جائے گا تو اس صورت میں یا خود صاحب حدیث ﷺ کی ذات سے اعتماد اٹھانا ہوگا یا پوری امت کو غلط کار اور دروغ گو کہنا ہوگا۔انکار حدیث کی تیسری کوئی صورت نہیں۔اور ان دونوں کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔اگر معاذ اللہ خود صاحب حدیث ﷺ یا چودہ سو سالہ امت سے اعتماد اٹھالیا جائے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں، کہ اسلام اور قرآن پر بھی ان کا اعتماد نہیں۔اور دین وایمان کے ساتھ بھی ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ان حدیث رسول ﷺ کے متعلق بے اعتمادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کو ایک لحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لانا چاہئے کہ اس تمام تر سعی مذموم کے باوجود وہ اسلام اور قرآن کو بے اعتمادی کے جھگڑے سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

❁ ❁ ❁

۵-تنقیح بحث

اب تمام تر بحث جو آپ کے سامنے آئے گی، وہ نفس حدیث سے متعلق ہوگی، سند حدیث اور رجال سند کی بحث کو ہمارے موضوع سے خارج سمجھنا چاہئے۔

ان ابتدائی اشارات کے بعد ہم پہلے سوال پر غور کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ۲۳ سالہ

دورِ نبوت کے ارشادات، کلمات طیبات، قضایا اور فیصلے، افعال واحوال، سیر واخلاق، الغرض اس طویل مدت میں آنحضرت ﷺ نے امت کو جو زبانی حکم دیا یا جو کچھ عملاً کر دکھلایا، یا کسی عمل کی تصویب قولاً یا سکوتاً فرمائی (ان ہی امور کے مجموعہ کا نام حدیث ہے)

❁ ان سب کو قرآن مجید کیا مرتبہ دیتا ہے؟

❁ خود آنحضرت ﷺ کے نزدیک ان کی حیثیت کیا تھی؟

❁ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے تقریباً صد سالہ دور میں ان کے ساتھ کیا تعلق رکھا؟

❁ صحابہ کرام کے بعد کی امت کی نظر میں ان کا کیا مرتبہ رہا؟

❁ عقل صحیح کی روشنی میں ان کا کیا مقام ہے؟

یہ پانچ نکات ہیں، جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک مجلّاتی مضمون میں جس قدر شرح وبسط کی گنجائش ہوسکتی ہے حتی الوسع اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حق تعالیٰ سوءِ فہم اور قصورِ تعبیر سے حفاظت فرمائیں (آمین)

۱- فرمودہ رسول ﷺ کو بلا چون و چرا قبول کرو

قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے جو کچھ دیا جائے۔ اس کو بلا چون و چرا قبول کرلیں اور آپ کے منع کردہ امور سے باز رہیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا، تو ان کے حق میں شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

(ترجمہ) اور رسول تمہیں جو کچھ بھی دے دیں۔ اس کو لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والے ہیں۔

۲- حکم نبوی سے روگردانی باعث فتنہ وعذاب ہے

آپ ﷺ کے امر کی مخالفت کرنے والے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے کہ ان کی یہ روش بدترین فتنہ اور دردناک عذاب میں انہیں دھکیل کر رہے گی۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهِ أن تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ (النور:٦٣)

(ترجمہ) اور جولوگ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔انہیں ڈرنا چاہئے، کہ کہیں ان کو کوئی عظیم فتنہ پیش نہ آجائے یا کہیں ان کو عذاب الیم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

چنانچہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

یعنی اللہ اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں ان کے دلوں میں کفر ونفاق وغیرہ کا فتنہ ہمیشہ کے لئے جڑ پکڑ نہ جائے۔اوراس طرح دنیا کی کسی سخت آفت یا آخرت کے دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہوجائیں،العیاذ باللہ۔(تفسیر عثمانی ص ۴۶۶)

۳-اطاعت نبوی باعث رحمت خداوندی ہے

رحمت خداوندی کے نزول کو آپ ﷺ کی اطاعت کاملہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔فرمان باری ہے۔

﴿وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (النور٥٦)

''اور اے مسلمانوں نماز کی پابندی رکھو،اور زکوٰۃ دیا کرو،اور باقی احکام میں بھی رسول ﷺ کی اطاعت کیا کرو۔تاکہ تم پر کامل رحم کیا جائے۔(ترجمہ حکیم الامت رحمہ اللہ)

۴-فوز وفلاح کا راز

ہر قسم کی فوز وفلاح،رشد وہدایت،اور بہبودیٔ دنیا وآخرت کو آپ ﷺ کی اطاعت میں منحصر قرار دیا گیا۔

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا، ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا﴾ (النساء٦٩)

(ترجمہ) ''اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا۔تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔یعنی انبیاء اور

صدیقین، اور شہدا اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں۔''

۵-اتباع رسول ﷺ محبت ومحبوبیت الٰہی کا معیار ہے

دعوائے محبت خداوندی کے صدق وکذب کا امتحان کرنے کے لئے اتباعِ محبوبِ خدا ﷺ کو معیار قرار دیا گیا۔ اسی کے ساتھ آپ کی ہر ادا کی نقل اتارنے والوں کو مقام محبوبیت پر فائز ہونے کی بشارت اور مغفرت سے ہمکنار ہونے کی خوشخبری سے نوازا گیا ہے۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۳۰)

(ترجمہ) آپ ﷺ فرمادیجئے۔ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔ تمہارے گناہ بخش دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بہت رحم والے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''دشمنان خدا کی موالات ومحبت سے منع کرنے کے بعد خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں۔ یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو، تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمد ﷺ کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہوجائے گا جو شخص جس قدر حبیب خدا محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ چلتا، اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے، اسی قدر سمجھنا چاہئے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعوے میں سچا ہوگا، اتنا ہی حضور ﷺ کی پیروی میں مضبوط ومستعد پایا جائے گا۔ جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا۔ اور اللہ کی محبت اور حضور ﷺ کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری باطنی مہربانیاں مبذول ہوں گی۔ مختصراً ان آیات میں پیغمبر آخرالزماں کی اطاعت کی پرزور طریقے سے دعوت دی گئی ہے۔ (تفسیر عثمانی ص ۶۹)

۶-آپؐ کی ذات گرامی تصفیہ طلب امور میں بحیثیت آخری عدالت!

اعلان کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ کی اطاعت کو جب تک شعار زندگی نہ بنایا جائے گا اور ہر قسم

کے تصفیہ طلب امور کے لئے آپ کی ذات پاک کو آخری عدالت کی حیثیت نہیں دی جائے گی اہل ایمان کو نہ ذرہ خیر و برکت میسر آسکتا ہے نہ اس کے بغیر کسی اچھے انجام کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وأولِي الأمْرِ مِنْكُمْ، فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْه إلى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إنْ كُنْتُمْ تُؤمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَّ أحْسَنُ تأوِيْلاً﴾ (النساء:۵۹)

(ترجمہ) اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو، اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں سے جو لوگ اہل حکومت ہیں، ان کا بھی۔ پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کے حوالے کردیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب بہتر ہیں۔ اور انجام کار خوش تر ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ باہمی اختلافات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق حل کریں اور اگر کوئی اپنے اختلافات ختم کرنے کے لئے قرآن وسنت سے پہلوتہی کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج تصور ہوگا۔

علما نے لکھا ہے کہ اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں۔ ایک نے کہا کہ چلو شرع کی طرف رجوع کریں۔ دوسرے نے کہا کہ میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کیا ہے۔ تو اس کے یہ کلمات دائرۂ اسلام سے خارج کرنے والے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

۷- رسول اللہ ﷺ کا حکم واجب العمل ہے

آگاہ کیا گیا ہے کہ نہ صرف دینی امور بلکہ خالص دنیوی امور میں بھی کسی مومن مرد اور عورت کو آپ کے فیصلے کے بعد کسی قسم کی گنجائش نہیں کہ فیصلہ نبوت کے بعد وہ اپنے لئے ادنیٰ اختیار کا تصور بھی ذہن میں لائے۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤمِنٍ ولاَ مُؤْمِنَةٍ إذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أمْرًا أنْ يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أمْرِهِمْ﴾ (الاحزاب:۳۶)

(ترجمہ) اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں ہے۔ جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا وجوباً حکم دے دیں کہ (پھر) ان مومنین کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں۔ بلکہ عمل کرنا ہی واجب ہے۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۸- فیصلۂ نبویؐ سے انحراف باعث ہلاکت ہے

بات یہیں پوری نہیں ہوجاتی، بلکہ پُرجلال انداز میں ہر سننے والے کے کان کھول دیئے گئے کہ فیصلہ نبوی کے بعد جن لوگوں کو اپنے لئے کسی قسم کی اختیاری گنجائش پیدا کرنے کی فکر رہتی ہے، ایسے نافرمان صریح بھٹکے ہوئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب:٣٦)

(ترجمہ) اور جو شخص اللہ کا اور اسکے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

۹- ہدایت صرف اطاعت نبویؐ میں منحصر ہے

یہ بھی واضح کردیا گیا، کہ ہدایت صرف اطاعت نبویؐ میں منحصر ہے۔ اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کی پیروی کے علاوہ ہدایت کے تمام راستے بند ہیں۔ اس کے ساتھ بتلادیا گیا۔ کہ آپ ﷺ کے اوامر سے سرتابی کرنے والے کوتاہ اندیش لوگوں کو اس کے ہولناک نتائج کیلئے تیار رہنا چاہئے۔

﴿قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْ فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلا الْبَلاغُ الْمُبِيْنَ﴾ (النور:٥٤)

(ترجمہ) آپ کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم (اطاعت سے) روگردانی کروگے، تو سمجھ رکھو کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ وہی (تبلیغ) ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا۔ اور تمہارے ذمہ وہ ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے اور اگر تم نے ان کی اطاعت کرلی، تو راہ پر جالگو اور بہرحال رسول کے ذمہ صاف صاف طور پر پہنچادینا ہے۔

۱۰- مومن اور جذبۂ سمع وطاعت

واضح کردیا گیا کہ ایمان کا سب سے بڑا نشان آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنا، آپ ﷺ کے ہر حکم پر سمع وطاعت بجالانا، اور آپ ﷺ کے ہر فیصلہ پر سرتسلیم خم کردینا ہے۔ اور یہ کہ کامرانی اور کامیابی انہیں لوگوں کے قدم چومے گی، جو اپنے اندر یہ ایمانی صفات رکھتے ہوں گے۔

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوآ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُوْلُوْا

سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (النور: ۵۱)

(ترجمہ) مسلمانوں کا قول تو جبکہ ان کو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں یہ ہے کہ وہ (بطیب خاطر) کہتے ہیں۔ کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور ایسے لوگ آخرت میں فلاح پائیں گے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی ایک سچے مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے اور یہ ہونا چاہئے کہ جب کسی معاملے میں ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے۔ خواہ ان میں بظاہر ان کا نفع ہو، یا نقصان ایک منٹ کا توقف نہ کریں۔ فی الفور سمعًا وطاعةً کہہ کر حکم ماننے کے لئے تیار ہوجائیں۔ اس میں ان کی اصلی بھلائی اور حقیقی فلاح کا راز مضمر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

۱۱- گفت او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

بتلایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وعمل وحی الٰہی کا تابع اور منشائے خداوندی کا ترجمان ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ اپنی ذاتی خواہش سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی سے فرماتے ہیں۔

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى﴾ (النجم من أولى إلى الأربع آيات)

(ترجمہ) ''قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نہ راہ سے بھٹکے، اور نہ غلط رستے ہوئے اور نہ آپ (ﷺ) اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں اور ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

پس جس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ غلط روی کا احتمال ہے اور نہ وحی الٰہی کے خلاف کسی لفظ کے زبان مبارک پر آنے کا اندیشہ ہے، ایسی ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے ہر قول وفعل پر ہمہ دم وحی الٰہی کا پہرا رہتا ہو انصاف کیا جائے...

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو دلائل وبراہین سے محقق کرنے کے بعد خدا تعالیٰ آپ

کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا وہ بے شک ہمارا تابعدار ہے۔ اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھ کو اے رسولؐ ان لوگوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے ہم ان کو دیکھ لیں گے تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ آگے ثواب یا عتاب یہ ہمارا کام ہے۔''

۱۲- اطاعت نبویؐ کی حقیقت

یہ بھی اعلان کردیا گیا کہ آپ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، اور جو لوگ آپ ﷺ کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں سمجھتے وہ اپنی بدفہمی کی وجہ سے کفر کے مرتکب ہیں۔

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيهِمْ حَفِيْظاً﴾ (النساء: ۸۰)

ترجمہ: جس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی، اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے روگردانی کرے سو آپ کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے آپ کو نگراں کرکے نہیں بھیجا کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۱۳- ایک مثالی نمونہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول، علم و عمل، گفتار و کردار، نشست و برخاست غرضیکہ آپ ﷺ کی ذات سے صادر ہونے والی ہر چیز سراپا ہدایت ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی کو امت کیلئے بہترین مثالی نمونہ قرار دیا گیا۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمِ الآخِرِ، وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔''

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہر ایسے شخص کے لئے معیاری نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور جس کا دل ذکر الٰہی کی کثرت سے منور ہو، برعکس اس کے جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثالی نمونہ نہیں سمجھتا، اور آپ ﷺ کے اقوال وافعال کو واجب الاطاعت اور لائق اقتدا نہیں سمجھتا اسے نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ نہ آخرت پر۔ اس کا دل ذکر الٰہی کے نور سے محروم ہونے کی وجہ سے ظلمت کدہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا مطلب یہ ہے کہ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو دیکھو۔ سختیوں اور جانگداز حالات میں کیا استقلال رکھتے ہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ اندیشہ اور فکر ان ہی پر ہے مگر مجال ہے کہ پائے استقامت ذرا جنبش کھا جائے۔ جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں ان کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ذات منبع البرکات بہترین نمونہ ہے۔ چاہئے کہ ہر معاملہ، ہر ایک حرکت وسکون، اور نشست وبرخاست میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور ہمت واستقلال وغیرہ میں ان کی چال سیکھیں۔

۱۴- ایک نکتہ

آپ ﷺ کی اطاعت سے اعتقاداً پہلوتہی کرنے والوں پر صاف صاف کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۳۲)

(ترجمہ) آپ فرمادیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی۔ پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو سن رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔''

۱۵- فیصلہ نبوی سے منحرف ظالم ہے

آپ ﷺ کے فیصلوں سے اعراض کرنے والوں کو شک وتردد اور نفاق کے مریض، غلط اندیش اور ظالم قرار دیا گیا۔

وَاِذَا دُعُوْآ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْآ اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○ اَفِىْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهُ بَلْ اُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (النور ع٦، آیت ٥١)

(ترجمہ) ''اور یہ لوگ جب اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اس غرض کے لئے بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردیں تو ان میں ایک گروہ پہلوتہی کرتا ہے۔ اور اگر ان کا حق ہو تو سر تسلیم خم کئے ہوئے آپ کے پاس آتے ہیں۔ آیا ان کے دلوں میں مرض ہے یا یہ شک میں پڑے ہیں یا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم نہ کرنے لگیں، نہیں! بلکہ یہ لوگ سراسر ظالم ہیں۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

۱۶- اتباع رسول ﷺ سے پہلوتہی منافقانہ عمل ہے

آپ ﷺ کی اتباع سے انحراف کرنے والوں کو صاف صاف منافق اور ایمان سے عاری قرار دیا گیا۔

﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ (النساء: ٦١)

(ترجمہ) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلوتہی کرتے ہیں۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یعنی جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل فرمایا ہے اس کی طرف آؤ۔ ظاہر میں چونکہ مدعی اسلام ہیں، اس لئے صاف طور پر تو انکار نہیں کرسکتے مگر آپ ﷺ کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچتے ہیں اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے۔ اور رسول ﷺ کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔ (ص ۱۱۳)

۱۷- ارشادات نبویؐ سے بے اعتنائی برتنے والے کا حکم

آپ کے پاک ارشادات کے ساتھ بے اعتنائی برتنے والوں اور آپ کے اقوال شریفہ کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کے متعلق اعلان کیا گیا کہ ان کے قلوب پر خدائی مہر لگ چکی ہے، جس

کی وجہ سے وہ ایمان ویقین اور رشد وہدایات کی استعداد گم کر چکے ہیں اور ان لوگوں کی ساری تگ ودوخواہش نفس کی پیروی تک محدود ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتّٰى إِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا. أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْا أَهْوَاءَهُمْ﴾ (محمد:١٦)

(ترجمہ) اور بعض آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کی طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہل علم سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تحقیر کے طور پر) کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی کیا بات فرمائی تھی؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں۔ (ترجمہ حضرت تھانوی بتصرف یسیر)

۱۸-اسلامی دستور کا دوسرا مآخذ احادیث نبوی ہیں

قرآن کریم نے صاف صاف یہ اعلان بھی کردیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو صرف اسی مقصد کیلئے بھیجا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار اور آپ کے ارشادات سے سرتابی کرنا گویا انکار رسالت کے ہم معنی ہے۔ اس طرح آپ کی اطاعت کے منکرین انکار رسالت کے مرتکب ہیں۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:٦٤)

(ترجمہ) اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔''

قرآن کریم کی وہ آیات جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اہل ایمان کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے، بے شمار ہیں۔ ان میں سے یہ چند آیات آپ کے سامنے ہیں۔ کتاب اللہ کے ان واضح اعلانات کی روشنی میں یہ فیصلہ بالکل آسان ہے، کہ اسلام میں ذات اقدس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مرتبہ کیا ہے؟ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی اطاعت اور پیروی کا حکم خود قرآن ہی میں موجود ہے اور جب قرآن کریم ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی قرار دیتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو جب قرآن ہی وحی خداوندی بتلاتا ہے (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ

یُوحٰی اور آپ ﷺ کے کلمات طیبات کو جب قرآن ہی ''گفتہ او گفتہ اللہ بود'' کا مرتبہ دیتا ہے تو بتلایا جائے کہ حدیث نبوی کے حجت دینیہ ہونے میں کیا کسی شک وشبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ اور کیا حدیث نبوی کا انکار کرنے سے کیا خود قرآن ہی کا انکار لازم نہیں آئے گا؟ اور کیا فیصلہ نبوت میں تبدیلی کے معنی خود قرآن کو بدل ڈالنا نہیں ہوں گے۔ اور اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم بھی تو امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سنا، اور سن کر اس پر ایمان لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ''یہ قرآن ہے'' یہ ارشاد بھی تو حدیث نبوی ہے۔ اگر حدیث نبوی حجت نہیں تو قرآن کریم کا قرآن ہونا کس طرح ثابت ہوگا۔ آخر یہ کونسی عقل ودانش کی بات ہے کہ اس مقدس ومعصوم زبان سے صادر ہونے والی ایک بات تو واجب التسلیم ہو اور دوسری نہ ہو؟

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''یہ تو میرے میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور یہ میرا کلام ہے، ورنہ ہم نے تو دونوں کو ایک ہی زبان سے صادر ہوتے ہوئے سنا تھا۔''

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن تو حجت ہے مگر حدیث حجت نہیں ہے ان ظالموں کو کون بتلائے کہ جس طرح ایمان کے معاملہ میں خدا اور رسول کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے۔ ایک کو تسلیم کرلیجئے تو دوسرے کو بہرصورت تسلیم کرنا ہوگا اور ان میں سے ایک کا انکار کردینے سے دوسرے کا انکار آپ سے آپ ہوجائے گا۔ خدائی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کے کلام کو تسلیم کرنے کا دعویٰ کیا جائے اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو ٹھکرایا جائے۔ وہ ایسے ظالموں کے خلاف صاف اعلان کرتا ہے۔

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ.

(ترجمہ) ''پس اے نبی! یہ لوگ آپ کے کلام کو نہیں ٹھکراتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کے منکر ہیں۔''

لہٰذا جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے اور کلام اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں انہیں لامحالہ رسول اور کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ ورنہ ان کا دعویٰ ایمان حرف باطل ہے۔ (باقی آئندہ)

❁ ❁ ❁

اکابر دیوبند کیا تھے؟

(۲/۱)

از: مولانا محمد تقی عثمانی
کراچی، پاکستان

اکابر دیوبند کیا تھے؟ اس کا جواب مختصر لفظوں میں یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ وہ خیر القرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج ومذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے، لیکن ان مختصر جملوں کی تشریح وتفصیل کرنے بیٹھیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی خصوصیات کو لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ان کی خصوصیات کا تعلق درحقیقت اس مزاج ومذاق سے ہے جو صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم) کی سیرتوں اور اُن کے طرزِ زندگی سے مستنیر تھا اور مزاج ومذاق وہ چیز ہے جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ کے ذریعے ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کو سونگھا تو جاسکتا ہے لیکن اس کی پوری کیفیت کو الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اُن حضرات کے مزاج ومذاق کو ان کی صحبتوں اور ان کے واقعات سے سمجھا جاسکتا ہے مگر اس کی منطقی تعبیر ناممکن ہے۔

لہٰذا اس مضمون میں اکابر دیوبند کی خصوصیات وامتیازات کو نظری طور سے بیان کرنے کے بجائے اُن کے چند متفرق واقعات سنانے مقصود ہیں جن سے ان کی خصوصیات زیادہ واضح اور آسان طریقے سے سمجھ میں آسکیں گی... وباللّٰہ التوفیق!

علم وفضل اور اُس کے ساتھ تواضع وللّٰہیت

اگر صرف وسعت مطالعہ، قوتِ استعداد اور کثرتِ معلومات کا نام علم ہو تو یہ صفت آج بھی ایسی کمیاب نہیں لیکن اکابر دیوبند کی خصوصیت یہ ہے کہ علم وفضل کے سمندر سینے میں جذب کرلینے کے باوجود اُن کی تواضع، فنائیت اور للّٰہیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ محاورہ زبان زدِ عام ہے کہ ''پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ جھکتی ہے'' لیکن ہمارے زمانے میں اس محاورے کا عملی مظاہرہ جتنا اکابر دیوبند کی زندگی میں نظر آتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱- بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بحر ناپیدا کنار تھے۔ اُن کی تصانیف آبِ حیات، تقریر دلپذیر، قاسم العلوم اور مباحثہ شاہجہاں پور وغیرہ سے اُن کے مقامِ بلند کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض تصانیف تو ایسی ہیں کہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہم عصر بزرگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا یہ جملہ دارالعلوم میں معروف تھا کہ ''میں نے آبِ حیات کا چھ مرتبہ مطالعہ کیا ہے، اب وہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے۔''

اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

''اب بھی مولانا (نانوتویؒ) کی تحریریں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور زیادہ غور وخوض کی مشقت مجھ سے برداشت ہوتی نہیں، اس لیے مستفید ہونے سے محروم رہتا ہوں اور اپنے دل کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لیے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں پھر کیوں مشقت اٹھائی جائے''۔(۱)

ایسے وسیع وعمیق علم کے بعد، بالخصوص جب کہ اس پر عقلیات کا غلبہ ہو، عموماً علم وفضل کا زبردست پندار پیدا ہوجایا کرتا ہے لیکن حضرت نانوتویؒ کا حال یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

''جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے، اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک کا بھی پتہ نہ چلتا۔''(۲)

چنانچہ اُن کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ بقول مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ:

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ جس طالب علم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اُس سے کبھی کبھی جوتے اُٹھوایا کرتے تھے اور جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے اُس کے جوتے خود اُٹھالیا کرتے تھے''۔(۳)

۲- یہی حال حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ انھیں اُنکے تفقّہ کے مقامِ بلند کی بناء پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے ''ابوحنیفۂ عصر'' کا لقب دیا تھا اور وہ اپنے عہد میں اسی لقب سے معروف تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے بلند پایہ محقق جو علامہ شامیؒ کو ''فقیہ النفس'' کا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، حضرت گنگوہیؒ کو ''فقیہ النفس'' فرمایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ واقعہ سناتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی۔ سب طلبہ کتابیں لے لے کر اندر کو بھاگے مگر مولاناؒ سب طلباء کی جوتیاں جمع کر رہے تھے کہ

اُٹھا کر لے چلیں۔لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے‘‘(۴)

۳- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے علم وفضل کا کیا ٹھکانا؟ لیکن حضرت تھانویؒ راوی ہیں کہ ’’ایک مرتبہ مراد آباد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے وعظ کہنے کے لیے اصرار کیا۔مولاناؒ نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے مگر لوگ نہ مانے تو اصرار پر وعظ کے لیے کھڑے ہوگئے اور حدیث ”فقیه واحد أشدّ علی الشیطٰن من ألف عابد“ پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ:

’’ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے۔‘‘

مجمع میں ایک مشہور عالم موجود تھے۔انھوں نے کھڑے ہوکر کہا کہ:’’یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آوے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں۔‘‘

حضرت شیخ الہندؒ کا جوابی ردِّعمل معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ذرا دیر گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ اگر اُن کی جگہ ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ ترجمہ صحیح تھا اور اُن صاحب کا اندازِ بیان توہین آمیز ہی نہیں، اشتعال انگیز بھی تھا۔لیکن اس شیخ وقت کا طرزِ عمل سنیے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر:

’’مولانا فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں ہے مگر ان لوگوں نے نہیں مانا۔خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہوگئی، یعنی آپ کی شہادت۔‘‘

چنانچہ وعظ تو پہلے ہی مرحلے پر ختم فرمادیا، اس کے بعد اُن عالم صاحب سے بطرزِ استفادہ پوچھا کہ ’’غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں‘‘ انھوں نے فرمایا کہ أشدّ کا ترجمہ أثقل (زیادہ بھاری) نہیں بلکہ أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کا آتا ہے۔‘‘ مولاناؒ نے برجستہ فرمایا کہ ’’حدیث وحی میں ہے یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو أشدّ علیّ“ (کبھی مجھ پر وحی گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) کیا یہاں بھی أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ہیں؟ اس پر وہ صاحب دم بخود رہ گئے۔(۵)

۴- حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جب کانپور میں مدرس تھے، انھوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مدعو کیا، کانپور میں بعض اہل علم معقولات کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف بھی مائل تھے۔ادھر علمائے دیوبند کی زیادہ توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لیے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علمائے دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں ہے۔حضرت تھانویؒ اُس وقت نوجوان تھے اور اُن کے دل

میں حضرت شیخ الہندؒ کو مدعو کرنے کا ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ یہاں حضرتؒ کی تقریر ہوگی تو کانپور کے ان علماء کو پتہ چلے گا کہ علمائے دیوبند کا علمی مقام کیا ہے؟ اور وہ منقولات ومعقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہوئی، حسن اتفاق سے تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانویؒ شیخ الہندؒ کی تقریر سنانا چاہتے تھے، جلسہ میں نہیں آئے تھے۔ جب حضرتؒ کی تقریر شباب پر پہنچی اور اُس معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لے آئے جن کا حضرت تھانویؒ کو انتظار تھا۔ حضرت تھانویؒ اس موقع پر بہت مسرور ہوئے کہ اب ان حضرات کو شیخ الہندؒ کے علمی مقام کا اندازہ ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہندؒ نے اُن علماء کو دیکھا۔ تقریر کو مختصر کر کے فوراً ختم کر دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ موجود تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ:

''حضرت! اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا، آپ بیٹھ کیوں گئے؟''

شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ''ہاں! دراصل یہی خیال مجھے بھی آ گیا تھا۔''

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ کسی یہودی نے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر دی تھی تو وہ اس پر چڑھ دوڑے اور اُسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جو اپنے آپ کو بے بس پایا تو کھسیانا ہو کر اُس نے حضرت علیؓ کے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ اُس کو چھوڑ کر فوراً الگ ہو گئے اور پوچھنے پر بتایا کہ میں پہلے آنحضرت ﷺ کی محبت کی بناء پر اس یہودی سے اُلجھا تھا۔ اگر تھوکنے کے بعد کوئی اور کارروائی کرتا تو یہ اپنے نفس کی مدافعت ہوتی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس عمل سے حضرت علیؓ کی یہ سنت تازہ فرمادی۔ مطلب یہی تھا کہ اب تک تو تقریر نیک نیتی سے خالص اللہ کے لیے ہو رہی تھی لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لیے ہوتی، اس لیے اسے روک دیا۔ (۶)

۵- مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب معقولات کے مسلّم عالم تھے۔ انھوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی شہرت سن رکھی تھی، ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا معین الدین صاحبؒ نے اُن سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ''مجھے حضرت مولانا

محمود حسن صاحبؒ سے ملنا ہے'' وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیریؒ کو اندر لے گئے، آرام سے بٹھایا اور کہا کہ ''ابھی ملاقات ہوجاتی ہے'' مولانا اجمیریؒ منتظر رہے، اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا۔ اس کے بعد مولانا اجمیری نے کہا کہ ''حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو اطلاع دیجیے'' اُن صاحب نے فرمایا ''آپ بے فکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں'' تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا، مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ ''میں مولانا محمود حسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، آپ اُنھیں اطلاع کردیجیے''۔ ان صاحب نے فرمایا ''اُنھیں اطلاع ہوگئی ہے آپ کھانا تناول فرمائیں ابھی ملاقات ہوجاتی ہے'' مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھالیا تو اُن صاحب نے اُنھیں پنکھا جھلنا شروع کردیا۔ جب دیر گزر گئی تو مولانا اجمیریؒ برہم ہوگئے اور فرمایا کہ آپ میرا وقت ضائع کررہے ہیں، میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہوچکی ہے، ابھی تک آپ نے اُن سے ملاقات نہیں کرائی۔ اس پر وہ صاحب بولے کہ:

''دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں۔ البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے۔''

مولانا معین الدین صاحب یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور پتہ چل گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چیز ہیں؟'' (۷)

۶- امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں نقل کیا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ ''اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالیؒ جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے۔'' یہ واقعہ بیان کرکے حکیم الامتؒ نے فرمایا: ''میں کہتا ہوں کہ میرے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔'' (۸)

انہی حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعہ حضرت مولانا محمد انوری صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ مقدمہ بھاولپور کے موقع پر جب حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے کفر پر بے نظیر تقریر فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ ''جو چیز دین میں تواتر سے ثابت ہو اُس کا منکر کافر ہے'' تو قادیانیوں کے گواہ نے اس پر اعتراض کیا:

''آپ کو چاہیے کہ امام رازیؒ پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں علامہ بحر العلومؒ نے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے متواتر معنوی انکار کیا ہے۔''

اس وقت بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، سب کو پریشانی ہوئی کہ فواتح الرحموت اس وقت پاس

نہیں ہے، اس اعتراض کا جواب کس طرح دیا جائے؟ مولانا محمد انوریؒ جو اس واقعے کے وقت موجود تھے، فرماتے ہیں:

''ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب نہ تھی۔ مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ حیران تھے کہ کیا جواب دیں گے؟''

لیکن اسی حیرانی کے عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ کی آواز گونجی: ''جج صاحب! لکھیے، میں نے بتیس سال ہوئے، یہ کتاب دیکھی تھی، اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے۔ امام رازیؒ دراصل یہ فرماتے ہیں کہ حدیث لاتجتمع امتی علی الضلالۃ تواتر معنوی کے رُتبے کو نہیں پہنچی، لہٰذا انھوں نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے، نہ کہ تواتر معنوی کے حجت ہونے کا۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے۔ ان کو کہو کہ عبارت پڑھیں۔ ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں۔''

چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی۔ واقعی اس کا مفہوم وہی تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا۔ مجمع پر سکتہ طاری ہوگیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

''جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مُفحَم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان شاء اللہ مُفحَم نہیں ہونے کا۔''(۹)

ایک طرف علم وفضل اور قوت حافظہ کا یہ محیر العقول کارنامہ دیکھیے کہ بتیس سال پہلے دیکھی ہوئی کتاب کا ایک جزوی حوالہ کتنی جزرسی کے ساتھ یاد رہا، دوسری طرف اس موقع پر کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کتنے بلند بانگ دعوے کرتا، لیکن خط کشیدہ جملہ ملاحظہ فرمایئے کہ وہ تواضع کے کس مقام کی غمازی کررہا ہے؟ اور یہ محض لفظ ہی نہیں ہیں، وہ واقعتاً اپنے تمام کمالات کے باوصف اپنے آپ کو ایک معمولی طالب علم سمجھتے تھے اور اس دعائے نبویؐ کے مظہر تھے کہ اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی أعین النّاس کبیرا.

۶- حضرت مولانا محمد انوریؒ ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر تشریف لے جارہے تھے، بس کے انتظار میں سیالکوٹ اڈّے پر تشریف فرما تھے، ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا ''نہیں! میں طالب علم ہوں'' اس نے کہا ''آپ کو اسلام کے متعلق علم ہے؟'' فرمایا ''کچھ کچھ'' پھر اُن کی صلیب کے متعلق فرمایا کہ ''تم غلط سمجھے ہو۔ اس کی یہ شکل نہیں ہے۔'' پھر نبی کریم ﷺ کی نبوت پر چالیس دلائل دیے۔ دس قرآن سے دس تورات سے، دس انجیل سے اور دس عقلی۔ وہ پادری آپ

کی تقریر سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے اپنے مفادات کا خیال نہ ہوتا تو میں مسلمان ہوجاتا، نیز یہ کہ مجھے خود اپنے مذہب کی بہت سی باتیں آپ سے معلوم ہوئیں۔(۱۰)

۷- احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بار بار یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں ملاحسن پڑھاتا تھا تو ایک روز اس کی عبارت پر کچھ شبہ ہوا جو حل نہیں ہورہا تھا۔ میں نے سوچا کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کے بارے میں استفسار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں کتاب لے کر ان کی تلاش میں نکلا، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے اور جب وہ اپنی جگہ پر نہ ہوں تو ان کا کتب خانہ میں ہونا متعین تھا۔ میں کتب خانہ میں پہنچا تو وہ کتب خانے کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعہ میں مشغول تھے۔ میں ابھی نیچے ہی تھا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا اور اوپر ہی سے میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا کہ ''ملاحسن کے ایک مقام پر کچھ اشکال ہے وہ سمجھنا تھا۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا ''عبارت پڑھیے'' میں نے عبارت پڑھنی شروع کی تو بیچ ہی میں روک کر فرمایا: ''اچھا! یہاں آپ کو یہ شبہ ہوا ہوگا'' اور پھر بعینہٖ وہی اشکال دُہرادیا جو میرے دل میں تھا۔ میں نے تصدیق کی کہ واقعی یہی شبہ ہے، اس پر انھوں نے اس کے جواب میں وہیں سے ایسی تقریر فرمائی کہ تمام اشکال کافور ہوگئے۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ دراز سے حدیث کی تدریس میں مصروف تھے اور منطق کی کتابوں سے واسطہ تقریباً ختم ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ حافظہ اور یہ استحضار کرشمۂ قدرت نہیں تو اور کیا ہے؟

۸- احقر نے اپنے والد ماجد سے بھی سنا ہے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم سے بھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۳۲۱ھ میں علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی مشہور شرح ہدایہ ''فتح القدیر'' اور اس کے تکملہ کا مطالعہ بیس سے کچھ زائد ایام میں کیا تھا اور کتاب الحج تک اس کی تلخیص لکھی تھی اور انھوں نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کا جواب بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد مدت العمر ''فتح القدیر'' کی مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور کسی تازہ مطالعہ کے بغیر اس کی نہ صرف باتوں بلکہ طویل عبارتوں تک کا حوالہ سبق میں دیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ انھوں نے ۱۳۴۷ھ میں ہم سے یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا:

''چھبیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا، اگر مراجعت کروگے تفاوت کم پاؤگے۔''(۱۱)

۹- حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلم حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ وہ

فرماتے ہیں کہ درس سے فراغت کے بعد میں جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلے سے لکھے ہوئے متعدد سوالات کے جواب اُن سے معلوم کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا حوالہ میں نے دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہوسکا۔ فرمایا ''مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہوگئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور انھیں پتہ نہیں چلتا، ورنہ یہ اشکال سب کو پیش آنا چاہیے'' پھر فرمایا کہ ''صحیح عبارت اس طرح ہے'' مولانا نعمانی مدظلہم لکھتے ہیں:

''اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات فرمائی تھی''۔(۱۲)

۱۰- حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے حالات کی ضرورت تھی۔ مجھے ان کی تاریخ نہ ملی۔ چنانچہ میں حسب معمول حضرت شاہ صاحبؒ کے درِدولت پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرضِ وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتے بعد وصال ہونے والا تھا۔ کمزور بے حد ہو چکے تھے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے آنے کی غرض بتائی تو انھوں نے فرمایا کہ ادب اور تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجیے اور تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء یاد بھی نہ رہیں گے۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لیے اتنا طویل وعریض مطالعہ کروں۔ بس آپ ہی اس شخص کی دروغ گوئی کے متعلقہ واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرمادیں، میں اُنہی کو آپ کے حوالہ سے جزوِ کتاب بنادوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ، اُس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کردی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے۔ آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا پھر اُس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان اس طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمارہے ہیں چنانچہ میں نے تعجب آمیز لہجے میں عرض کیا کہ ''حضرت! شاید کسی قریبی زمانے ہی میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟'' سادگی سے فرمایا ''جی نہیں! آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا۔ خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لیے پہنچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا

اوراس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا، بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا''۔(۱۳)

۱۱- یہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ تحریک خلافت کے دور میں جب امارتِ شرعیہ (عوام کی طرف سے قاضی مقرر کرنے) کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرے میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو ردّ ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحتاً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل وتوجیہہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ استنجا کے لیے تشریف لے گئے تھے وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق بن نہیں پڑتی۔ حضرت ممدوحؒ حسب عادت ''حسبنا اللہ'' کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے۔ اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی۔ دیکھا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی۔ جونہی اس سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہوگیا اور سب کا تحیر رفع ہوگیا۔(۱۴)

۱۲- حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ طلاق کے ایک مسئلہ میں کشمیر کے علماء میں اختلاف ہوگیا۔ فریقین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حکم بنایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دونوں کے دلائل غور سے سنے۔ اُن میں سے ایک فریق اپنے موقف پر فتاویٰ عمّادیہ کی ایک عبارت سے استدلال کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

''میں نے دارالعلوم کے کتب خانے میں فتاویٰ عمادیہ کے ایک صحیح قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز نہیں ہے لہٰذا یا تو ان کا نسخہ غلط ہے یا یہ لوگ کوئی مغالطہ انگیزی کر رہے ہیں۔''(۱۵)

ایسے علم وفضل اور ایسے حافظہ کا شخص اگر بلند بانگ دعوے کرنے لگے تو کسی درجہ میں اس کو حق پہنچ سکتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اُس قافلۂ رُشد وہدایت کے فرد تھے جس نے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ کی حدیث کا عملی پیکر بن کر دکھایا تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب انھوں نے حضرت مولانا بنوری مدظلہم کو اپنا فیصلہ لکھنے کا حکم دیا تو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ

"الحبر البحر" (عالم متبحر) کے دو تعظیمی لفظ لکھ دیے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا تو قلم ہاتھ سے لے کر زبردستی خود یہ الفاظ مٹائے اور غصہ کے لہجہ میں مولانا بنوری سے فرمایا:

''آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے''۔(۱۶)

پھر ایسا شخص جو ہمہ وقت کتابوں ہی میں مستغرق رہتا ہو، اُس کا یہ جملہ ادب وتعظیم کتب کے کس مقام کی نشان دہی کرتا ہے کہ:

''میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہوکر مطالعہ کرتا ہوں۔''

چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

''سفر وحضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کررہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدّب انداز میں بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کررہے ہوں۔''

اور یہ بھی فرمایا کہ:

''میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔''(۱۷)

۱۳- دارالعلوم کی تاریخ میں یہ جملہ بہت معروف ہے کہ دارالعلوم کی ابتداء دو ایسے بزرگوں سے ہوئی جن دونوں کا نام محمود تھا اور دونوں قصبۂ دیوبند کے باشندے تھے۔ ان میں شاگرد تو وہ محمود تھے جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے نام سے معروف ہوئے اور استاد حضرت ملا محمود صاحبؒ تھے۔ راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ملا محمود صاحبؒ نے فرمایا کہ سنن ابن ماجہ پر جو حاشیہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ محدث دہلویؒ کے نام سے چھپا ہوا ہے اس کا بڑا حصہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے مجھ سے لکھوایا ہے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ طلباء نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ علم کے دعوے اور نام ونمود کی خواہشات سے اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ خصلت بزرگ کو ایسا پاک رکھا تھا کہ عام آدمی کو یہ پہچاننا بھی مشکل تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہیں۔

اپنا گھریلو سودا سلف اور گوشت ترکاری خود بازار سے خرید کر لاتے اور گھر میں عام آدمیوں کی طرح زندگی گزارتے تھے مگر علوم کے استحضار اور حفظ کا عالم یہ تھا کہ راقم کے جدِّ امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کی ایک بڑی کتاب (جو غالباً منطق یا اصولِ فقہ کی کتاب تھی) اتفاقاً درس

سے رہ گئی تھی، انھیں یہ فکر تھی کہ دورۂ حدیث شروع ہونے سے پہلے یہ کتاب پوری ہوجائے چنانچہ انھوں نے مُلاّ محمود صاحبؒ سے درخواست کی۔ ملا صاحبؒ نے فرمایا کہ اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ بھی میرے تمام اوقات اسباق سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ایک وقت ہے کہ جب میں گھر کا گوشت ترکاری لینے کے لیے بازار جاتا ہوں، یہ وقت خالی گزرتا ہے، تم ساتھ ہوجاؤ تو اس وقفے میں سبق پڑھادوں گا۔ احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرماتے تھے کہ کتاب بڑی اور مشکل تھی جس کو دوسرے علماء غور ومطالعہ کے بعد بھی مشکل سے پڑھا سکتے تھے۔ مگر مُلاّ محمود صاحبؒ نے کچھ راستہ میں کچھ قصاب کی دوکان پر یہ تمام کتاب ہمیں اس طرح پڑھادی کہ کوئی مشکل ہی نظر نہ آئی۔ (۱۸)

۱۴- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، حضرتؒ طالب علمی کے زمانے ہی سے اپنی قوتِ استعداد، ذہانت وفطانت اور علم وعمل میں مصروف تھے لیکن جب ۱۳۰۰ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، اور دستار بندی کے لیے دیوبند میں بہت بڑا اور شاندار جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی تو حضرت تھانویؒ اپنے ہم سبقوں کو لے کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ''حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی۔ حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرمادیا جائے ورنہ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی۔'' حضرت نانوتویؒ کو یہ سن کر جوش آ گیا اور فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے، باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے۔ (۱۹)

سادگی اور مخلوقِ خدا کا خیال

۱۵- حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی اکابرِ دیوبند میں ہے۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ہم سبق ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ راستہ میں ایک بوڑھا ملا جو بوجھ لیے جارہا تھا، بوجھ زیادہ تھا اور وہ بمشکل چل رہا تھا، حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے یہ حال دیکھا تو اس سے وہ بوجھ لے لیا

اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچادیا۔ اس بوڑھے نے اُن سے پوچھا! ''اجی! تم کہاں رہتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں''۔ اس نے کہا: ''وہاں مولوی مظفرحسین بڑے ولی ہیں'' اور یہ کہہ کران کی بڑی تعریفیں کیں، مگرمولاناؒ نے فرمایا: ''اورتو اس میں کوئی بات نہیں ہے، ہاں نماز تو پڑھ لے ہے''۔ اس نے کہا ''واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟'' مولاناؒ نے فرمایا: ''میں ٹھیک کہتا ہوں'' وہ بوڑھا اُن کے سر ہوگیا، اتنے میں ایک اور شخص آ گیا جومولاناؒ کو جانتا تھا، اس نے بوڑھے سے کہا ''بھلے مانس! مولوی مظفرحسین یہی ہیں'' اس پر وہ بوڑھا مولانا سے لپٹ کر رونے لگا۔(۲۰)

۱۶- انہی مولانا مظفرحسین صاحبؒ کی عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے جس کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا اس سے پوچھ کر لادیتے اور طُرّہ یہ کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے کم ہوتے تھے، عموماً چیزیں غلّے کے عوض خریدی جاتی تھیں چنانچہ آپ گھروں سے غلّہ باندھ کر لے جاتے اور اس سے اشیاءِ ضرورت خرید کر لاتے تھے۔(۲۱)

۱۷- یہی حال دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ کا تھا۔ علم وفضل کا تو یہ عالم کہ آج ان کی ''عزیزالفتاویٰ'' عہدِ حاضر کے تمام مفتیوں کے لیے مآخذ بنی ہوئی ہے اور فتویٰ کے ساتھ شغف کا یہ حال کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جسے موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا تھا۔(۲۲) لیکن سادگی، تواضع اور خدمت خلق کا یہ مقام کا والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامات صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے، بوجھ زیادہ ہوجاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کو پہنچاتے۔''(۲۳)

راقم الحروف نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ہی سے زبانی سنا کہ اسی سودا سلف لانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کسی عورت کو سودا دینے کے لیے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی: ''مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں اتنی منگائی تھی۔'' چنانچہ یہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دور کرتا۔

۱۸- حضرت مولانا سید اصغرحسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ

کے لقب سے معروف تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے درجہ علیا کے استاد تھے، ان سے ابوداؤد پڑھنے والے اب بھی برصغیر میں ہزاروں ہوں گے، علوم قرآن وسنت کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم وفنون کے کامل محقق، مگر بہت کم گو، حدیث کے درس میں نہایت مختصر مگر جامع تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اُتر جائے اور شبہات خود بخود کافور ہوجائیں۔

انہی کا واقعہ ہے کہ آپ کا زنانہ مکان اور نشست گاہ کچی مٹی کی بنی ہوئی تھیں، ہر سال برسات کے مواقع پر اس کی لپائی پتائی ناگزیر تھی جس میں کافی پیسہ اور وقت خرچ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم) نے حضرت میاں صاحبؒ سے کہا کہ: ''حضرت! جتنا خرچ سالانہ اس کی لپائی پر کرتے ہیں، اگر ایک مرتبہ پختہ اینٹوں سے بنانے میں خرچ کرلیں تو دو تین سال میں یہ خرچ برابر ہوجائے اور ہمیشہ کے لیے اس محنت سے نجات ہو۔''

یہ سن کر پہلے تو فرمایا: ''ماشاء اللہ بات تو بہت عقل کی کہی، ہم بوڑھے ہوگئے ادھر دھیان ہی نہ آیا۔'' پھر کچھ توقف کے بعد جو حقیقت حال تھی وہ بتائی اور تب پتہ چلا کہ یہ حضرات کس مقام سے سوچتے تھے؟ فرمایا کہ:

''میرے پڑوس میں سب غریبوں کے کچے مکان ہیں، اگر میں اپنا مکان پکا بنوالوں تو غریب پڑوسیوں کو حسرت ہوگی اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے مکان پکے بناؤں''۔

حضرت والد صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت معلوم ہوا کہ یہ حضرات جو کچھ سوچتے ہیں وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوسکتی، چنانچہ انھوں نے اس وقت تک اپنے مکان کو پختہ نہیں کیا جب تک پڑوسیوں کے مکان پکے نہیں بن گئے۔'' (۲۴)

۱۹- انہی حضرت میاں صاحبؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب مدظلہم ان کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے آموں سے تواضع کی جب آم چوس کر فارغ ہوگئے تو والد صاحب مدظلہم گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اُٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے چلے، حضرت میاں صاحبؒ نے دیکھا تو پوچھا: ''یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے''؟ عرض کیا: ''چھلکے باہر پھینکنے جارہا ہوں'' ارشاد ہوا ''پھینکنے آتے ہیں یا نہیں''؟ والد صاحب نے کہا کہ ''حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟'' فرمایا: ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ، مجھے دو''، خود ٹوکری اُٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کیے، اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے

کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے معین جگہوں پر چھلے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں، والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ: ''ہمارے مکان کے قرب وجوار میں تمام غربا، ومساکین رہتے ہیں، زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نانِ جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے، اگر وہ پھلوں کے چھلکے یکجا دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا اس لیے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں، یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے ہیں، وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھالیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہیں، اُن کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔'' راقم الحروف کے برادرِ مرحوم مولانا محمد زکی کیفی صاحب جو اس واقعے کے وقت موجود تھے تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحبؒ خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھ لیتے ہوں، عموماً مہمانوں ہی کے لیے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود چھلکے گٹھلیوں کا یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں۔'' (۲۵) (باقی آئندہ)

حواشی:

(۱) اشرف السوانح، ص:۱۳۶، ۱۳۷، ج۱۔ (۲) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۷۶، نمبر۲۳۰۔ (۳) ایضاً، ص:۲۰۶، نمبر۲۸۸۔ (۴) ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۸۶، نمبر۴۳۶۔ (۵) یہ واقعہ مذکورہ تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ سے اور اسی کا خلاصہ حضرت میاں صاحبؒ نے حیاتِ شیخ الہند، ص:۱۶۷ میں بھی کیا ہے۔ (۶) یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے ایک ہم سبق عالم مولانا مغیث الدین صاحب سے سنا تھا جو دیوبند سے فارغ ہوکر معقولات پڑھنے کے لیے اجمیر چلے گئے تھے اور آخر میں مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے لیکن چونکہ واقعہ سنے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا۔ اس لیے چند سال پہلے حضرت والد صاحب مدظلہم نے ان سے حرمِ نبوی ﷺ میں اس کی تصدیق فرمائی۔ (۷) حیاتِ انور، ص:۱۱۹ بروایت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ (۸) انوارِ انوری، مؤلفہ مولانا محمد انوریؒ، ص:۳۲۔ (۹) ایضاً، ص:۳۶۔ (۱۰) نفحۃ العنبر، ص:۲۷ طبع مجلس علمی کراچی۔ (۱۱) حیاتِ انور، ص:۱۳۹۔ (۱۲) حیاتِ انور، ص:۲۲۵ تا ۲۲۸۔ (۱۳) حیاتِ انور، ص:۲۲۹، ۲۳۰۔ (۱۴) نفحۃ العنبر، ص:۲۷۔ (۱۵) حیاتِ انور، ص:۲۳۳۔ (۱۶) حیاتِ انور، ص:۲۳۳۔ (۱۷) ''میرے والد ماجد'' مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم: ص۵۴، ۵۵۔ (۱۸) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۴۸، نمبر۱۸۸۔ (۱۹) ارواحِ ثلاثہ، ص:۱۵۳، نمبر۱۹۷۔ (۲۰) نقوش وتاثرات، مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم، ص:۳۴۔ (۲۱) مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص:۴۳۔ (۲۲) نقوش وتاثرات، ص:۴۰۔ (۲۳) ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ، ص:۳۸، ۳۹، ج:۱، مضمون ''حضرت میاں صاحبؒ''۔ (۲۴) ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ، ص:۳۹، ج:۱۔ (۲۵) یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور ان کو خود حضرت مولانا محمود صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ نے سنایا تھا۔

فلسطین... تاریخ کے آئینے میں

از: مولانا ریداحمد نعمانی

وہ ارض مقدسہ جسے انبیاء کرام کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کے اردگرد برکت ہی برکت کا نزول ہے، جہاں سے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ روح القدس کے ہمراہ سفر معراج کے لیے پابرکاب ہوئے، جس دھرتی پر سید الثقلین ﷺ نے نبیوں کی امامت کرا کے امام الانبیاء کا لقب پایا، جی ہاں وہی پرعظمت و پرشوکت زیتون کے درختوں سے آراستہ و پیراستہ سرسبز وشاداب بقعہ ارضی، جہاں اسلام کی عظمت رفتہ اور جنت گم گشتہ کا نشان قبلہ اول کی صورت میں موجود ہے، جس کے فاتح اوّل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تھے، جس کے در و دیوار نے ایوبی کی تکبیر سنی تھی، جہاں خیر کا نور پھیلانے والوں اور شر کی تاریکی میں اضافہ کرنے والوں کے درمیان آخری مگر عظیم معرکہ بپا ہونے کا میدان سج چکا ہے، آج طاغوتی قوتوں کے زیرنگیں وقبضہ ہے۔ ''مغضوبین''، ''ضالین'' کے زیر سایہ وانتظام گزشتہ چھ عشروں سے مسلمانان فلسطین کا جانی، مالی اور اقتصادی استحصال میں مصروف عمل ہیں۔

''بھٹکی مادیت'' نے اپنے طرز فکر وسوچ اور بوالہوسی کا راگ اس طور پر الاپا ہے کہ غیر تو غیر ''اپنے'' بھی اس کی گردش اور بھنور میں غوطہ زن ہیں، فکر معاش، تعیش پسندی اور اپنی شکم سیری کی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہیں کہ اپنے آقا ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو ہی بھلا بیٹھے، جس میں آپ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کی تشبیہ ایک جسم سے دی ہے، بدن کے ایک عضو کی تکلیف والم پورے وجود میں سرایت کرتی اور محسوس کی جاتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے، عالم اسلام کے اس رستے ہوئے ناسور پر کوئی اینکر پرسن، کوئی وزیر ومشیر اور کوئی صاحب منصب وجاہ امت کی منتشر سوچ کو مجتمع، منظّم اور مربوط نہیں کرتا؟ آیئے اسی چبھتے سوال کے جواب کے تناظر میں ''بقعہ نور'' کی قدیم تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں جو شاید ہمارے ''خوابیدہ'' دلوں کو بیدار کرنے میں قوت عمل مہیا کر جائے!

محل وقوع کے اعتبار سے فلسطین براعظم ایشیاء کے مغرب میں بحرمتوسط کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اس علاقے کو آج کل مشرق وسطیٰ بھی کہا جاتا ہے، شمال میں لبنان اور جنوب میں خلیج عقبہ واقع ہے، جنوب مغرب میں مصر اور مشرق میں شام اور اردن سے اس کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ جبکہ مغرب میں بحرمتوسط کا طویل ساحل ہے، فلسطین کا رقبہ حفہ اور غزہ سمیت ۲۷ ہزار کلومیٹر پر مشتمل ہے۔

فلسطین کے طبعی جغرافیائی علاقوں میں فلسطین کا طویل ساحل جو ناقورہ سے لے کر رفح تک جنوب میں پھیلا ہوا ہے سرفہرست ہے۔ جس کا عرض ۱۶ سے ۱۸ کلومیٹر تک ہے، اس ساحل کے مشہور شہروں میں طولکرم، خان یونس، رملہ، عکا، یفاء، یافا اور غزہ ہیں۔ اسرائیل نے اپنا دارالحکومت بھی یافا کے شمال میں بنایا ہے، جبکہ پہاڑی سلسلوں میں نابلس، کرمل، خلیل اور القدس کے پہاڑی علاقے مشہور ہیں، واضح رہے کہ خلیل پہاڑ کے دامن میں خلیل شہر آباد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں مدفون ہیں۔ علاوہ ازیں قدس کے پہاڑوں میں سب سے اونچا پہاڑ جبل طور ہے، جس میں بیت المقدس کا علاقہ واقع ہے، مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی اسی شہر کی زینت ورونق ہیں۔ میدانی علاقوں میں نقب اور اغوار کے علاقے شامل ہیں، اغوار فلسطین کا مشرقی علاقہ ہے، جسے دریا اردن کاٹتا ہے اور بحرمیت بھی اس کے کنارے واقع ہے، اس علاقے میں اریحا نامی شہر ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔

فلسطین اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں کنعانیوں کا مرکز رہا ہے، ان علاقوں میں جتنے قدیم شہر تھے وہ سارے کنعانیوں نے ہی آباد کیے تھے، کنعانی قبیلے کی اہم شاخ ''یبوسی'' قوم نے القدس شہر بسایا تھا۔ کنعانی دور کے بعد عبرانی دور کی باری آتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارض کنعان کی طرف ہجرت فرمائی، بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے آپ کی اولاد مصر کی حکمراں بنی، پھر بتدریج قبطی ان پر غالب آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مصر سے نکالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں ان عبرانیوں نے کنعان کو فتح کیا یہاں سے عبرانی دور کا آغاز ہوا، عبرانیوں کے حکمرانوں میں دو جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام بھی گزرے ہیں۔

''بلست'' نامی قبیلہ مغرب سے جنگ زدہ ہوکر نکلا، اس نے اس علاقے کے ساحلی علاقوں یافا سے غزہ تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا، اس قبیلے نے اپنے مقبوضہ علاقے کا نام اپنے نام سے موسوم کرکے فلسطین رکھ دیا یہ نام ایسا غالب رہا کہ آج اس پورے خطے کو فلسطین ہی پکارا جاتا ہے،

ان نو وارد فلسطینیوں اور عبرانیوں کے مابین کئی جنگیں ہوئیں، جس کے نتیجہ میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کے سردار جالوت کو قتل کر دیا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔

۵۳۸ ق م میں فارس کے ایک بادشاہ نے شام کو پورے علاقے کو بشمول فلسطین قبضہ کرلیا، فارس کی حکومت ۳۳۲ ق م یہاں سے ختم ہوگئی۔ ۳۳۲ ق م میں ہی مقدونی بادشاہ سکندر اعظم نے یہ علاقہ فارسیوں سے ہتھیالیا، اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے یہاں یونانی ثقافت وتہذیب کو پروان چڑھانے کی سرتوڑ کوشش کی، اس مقصد برآوری کی خاطر انھوں نے کئی شہر آباد کئے، مدارس کھولے یونانی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا، لیکن اکثر علاقوں میں سریانی زبان وتہذیب کو لوگوں نے حرز جان بنائے رکھا۔

۶۳ ق م میں روم کے مشہور قائد ''بومی'' نے یونانیوں کا زور فلسطین میں توڑ ڈالا، پھر یہ علاقہ رومیوں کے پاس رہا، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں اسلام کا پھریرا اس علاقہ پر لہرایا، اس دور کی اہم خصوصیات میں سے چند اہم یہ ہیں: (۱) حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ (۲) یہودیوں کو دو مرتبہ شکست ہوئی۔ پہلی مرتبہ ۷۰ء میں ٹیطس رومی کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوئے اور دوسری دفعہ ۱۳۵ء میں جب یہود نے دوبارہ منظم ہونے کی کوشش کی، اس دور کے رومی بادشاہ ''معادریان'' نے خود حملہ کیا اور یہودیوں کو سفاکی سے قتل کیا اور باقی کو دنیا کے مختلف علاقوں میں جلاوطن کیا اب دو ہزار سال بعد اس دھتکاری ہوئی قوم کو فلسطین میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا ہے۔

فلسطین کی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس حوالے سے بہت واضح رہی ہے کہ ابتداء اسلام میں یہ ان کا قبلہ اوّل رہا ہے، اسی وجہ سے رومیوں کے ساتھ معرکے حضرت جناب نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہوگئے تھے۔ سرور دوعالم ﷺ نے اپنا آخری لشکر جیش اسامہ رومیوں کے مقابلے کے لیے ترتیب دیا ہی تھا کہ آپ اس دنیا سے پردہ فرما گئے، آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا، ارتداد کی مہم سے فارغ ہوکر خود بھی اس جانب توجہ دی۔ یہاں تک کہ ۶۱ھ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بیت المقدس مسلمانوں کے زیر قبضہ آ گیا۔

چھٹی صدی ہجری میں بلاد اسلامیہ پر صلیبیوں نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں فلسطین میں صلیبی حکومت قائم کرلی گئی، طاقت اور قوت کے بل بوتے پر ستر ہزار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، لیکن صلیبیوں کی یہ حکومت دیر پا ثابت نہ ہوسکی مشہور مجاہد صلاح الدین ایوبی نے جلد ہی بیت المقدس کو صلیبی پنجہ استبداد سے واگرالیا، ۲۷/رجب ۵۳۸ھ کو بیت المقدس دوبارہ تکبیر کے

زمزموں سے گونج اٹھا۔

جس وقت عالم اسلام کو استعماری طاقتوں نے اپنی سازشوں کا ہدف بنایا اور فلسطین کی سرزمین برطانیہ کے استعماری قبضہ میں آنے لگی تو مکار اور شاطر یہودیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس خطے کے حصول کی خاطر کوششیں تیز کردیں ۱۸۳۹ء میں سب سے پہلا مغربی سفارتخانہ جو بیت المقدس میں کھلا وہ حکومت برطانیہ کا تھا، جس کا واحد مقصد یہودیوں کی خدمت گذاری تھا، اس کے ساتھ ہی پوری دنیا سے یہودیوں کو بیت المقدس میں جمع کرنا شروع کردیا گیا، اس وقت پورے فلسطین میں صرف نو ہزار کے قریب یہودی تھے۔

۱۸۹۵ء میں ایک یہودی مفکر ''النمساوی ہیرتسل'' نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا ''یہودی مملکت'' جس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہودی قوم کو ایک حکومت کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے فلسطین سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ اس دور میں یہودیوں کی عالمی سطح پر دو بڑی کانفرنسیں ہوئیں، پہلی کانفرنس ۱۸۹۷ء اور دوسری ۱۸۹۸ء میں، جن کا حاصل یہ تھا کہ یہود اپنے قدیم وطن فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے منظّم ہوجائیں، چونکہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور وہی اس کے مالک ومتصرف تھی، اس کے مقابلے کے لیے قوم یہود نے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے شروع کردیئے۔

خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کے لیے انھوں نے مختلف سطحوں پر ساز باز شروع کی، جس میں بھاری رقوم دے کر ترکوں کو خریدا گیا، خود خلیفہ عبدالحمید کو لالچ دیئے گئے یہاں تک کہ ایک دفعہ ترکی کے یہودیوں کا ایک وفد سلطان سے ملا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین اگر یہودیوں کو دے دیا جائے تو اس کے بدلے ہم خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہ کر خلافت کے سارے قرضے اتار دیں گے، جواب میں سلطان نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر ان کو دکھایا پھر فرمایا ''اگر فلسطین کا اتنا حصہ بھی تم لینا چاہو گے تو نہیں ملے گا''۔

سلطان عبدالحمید سے مایوس ہوکر اللہ کے غضب کی ماری اس قوم نے ان کی شہرت عام کو بگاڑنے کی کوشش شروع کردی، چونکہ ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کی اجارہ داری تھی اس لیے اس ہتھیار سے کام لے کر سلطان پر ''رجعت پسند یا ورنسل پرست'' جیسے بے پر کے الزامات کا سلسلہ شروع کردیا گیا، نتیجتاً خلافت عثمانیہ میں قومی نعروں کی پروان ملی۔

۱۹۰۹ء سلطان عبدالحمید کا انتقال ہوا تو گویا اس دن سے اسرائیل کے وجود کی بنیاد پڑ گئی، حکومت میں موجود صہونیت نواز لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو برابر یہودیوں کو فلسطین منتقل

کرنے میں مدد دیتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار تھی اور یہی تعداد ۱۹۱۴ء میں ۸۵ ہزار ہوگئی۔

یہود ایک مالدار قوم تھے، ہر ملک میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور ساہوکاروں کی صورت میں موجود تھے، جس کی وجہ سے ملکوں کی سیاست اور معاملات پر ان کا اثر انداز ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا، انھوں نے خلاف عثمانیہ کو ہر طرح اور ہر سطح پر دباؤ میں رکھنے کی کوشش کی، اور دنیا کو باور کرایا کہ فلسطین کا حصول یہودیوں کے لیے ناگزیر ہے، لیکن خلافت عثمانیہ ان کے باطل عزائم اور ارادوں کے سامنے سد سکندری ثابت ہورہی ہے۔ چنانچہ اس بے حقیقت مفروضے کی بنیاد پر حکومت مصر کے توسط سے صحرا، سینا میں یہودیوں کو بسانے کی ایک مرتبہ کوشش بھی کی گئی، جس میں وہ ناکام ہوئے۔ اس کے بعد دنیا کی سیاست میں کچھ ایسے حالات آئے جو فلسطین میں بدی کی ''نمائندہ قوم'' کے لیے قیام حکومت کی راہ ہموار کرتے چلے گئے، جن میں چار حالات کا بطور خاص ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے: (۱) دو عالمی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا۔ (۲) ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام جس سے وہ دنیا کو اپنی مظلومیت ثابت کر پائے۔ (۳) خلافت عثمانیہ کا سقوط۔ (۴) فلسطین کا برطانوی استعمار کے زیر دست ہوجانا۔

آخر الذکر سبب کے تحت برطانوی استعمار نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے حتی المقدور تعاون کیا۔ مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا، یہودی بستیاں آباد کی گئیں، تل ابیب کو مضبوط کیا، یہودیوں کے استحکام سے مطمئن ہوکر خود ۱۴ر مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے نکلنے کا اعلان کیا، جاتے جاتے اہم مقامات، سرکاری دفاتر، ہوائی اڈے یہودیوں کو بطور بخشش دے گئے، جبکہ مسلمانوں کا جانی، مالی اور اقتصادی استحصال کیا گیا، جس کے نتیجے میں کچھ قتل ہوئے اور اکثر ہجرت پر مجبور ہوئے۔

یوں ۱۵ر مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیلی مملکت کا اعلان قیام ہوا، جسے چند ہی لمحوں میں امریکہ، روس اور یورپ نے تسلیم کرلیا، اسلامی ممالک میں سے صرف ترکی اور اس وقت کے شاہ ایران نے یہ ناجائز ریاست تسلیم کرکے اپنے فکری ضلالت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

❁ ❁ ❁

میرے قابل احترام اساتذۂ کرام

(۶)

حضرت مولانا سیّد حسن صاحب دیوبندیؒ

استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم دیوبند

از: مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

دوآبے کا یہ قصبہ ''دیوبند'' جو پوری دنیا میں معروف ہے، بڑا مردم خیز علاقہ ہے۔ اسی سرزمین سے وہ لوگ اٹھے ہیں جنھوں نے اپنے دورِشباب میں دارالعلوم جیسی درسگاہ کی بنیاد رکھی تھی تاریخ کے اوراق پلٹے جائیں تو ایسی ایسی شخصیات کے نام سامنے آتے ہیں جو اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ اور یہ لوگ جب ایک ادارے میں جمع ہوئے تو اس ادارے کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

یہ کوئی مبالغہ کی بات نہیں ہے، نہ نری عقیدت ہے، بلکہ حقیقت ہے کہ دیوبند نے ایسی ایسی شخصیات کو جنم دیا ہے کہ جن میں ایک ایک نام ہزاروں ناموں پر بھاری نظر آتا ہے۔ یوں کہئے کہ ایک سلسلۃ الذہب ہے، سنہری زنجیر کی کڑیاں ہیں اور دینی خدمات کا ایک سلسلہ ہے، جو برابر چلا آرہا ہے اور آج تک بھی وہ سلسلہ کسی نہ کسی درجے میں قائم ہے۔

میں نے اپنے اساتذہ کے تعلق سے کچھ تاثرات اور بیتی ہوئی باتیں قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری یہ روکھی پھیکی ماضی کی داستانیں لوگوں کو اتنا اپیل کریں گی کہ اس سلسلے کو اور آگے لے جانے کے تقاضے مجبور کریں گے کہ ابھی اس کو جاری رکھا جائے۔

اساتذہ کی فہرست پر نظر ڈالی تو ابھی بہت سے ایسے اہم نام باقی تھے جن کا تذکرہ نہ کرنا خود اپنے ساتھ بے انصافی ہوتی۔

میرے بہت ہی محسن، بہت ہی مشفق اور بہت ہی زیادہ تعلق رکھنے والے اساتذہ میں ایک نام دارالعلوم دیوبند کے تفسیر وحدیث کے استاذ مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ کا ہے۔

اگرچہ ان کا اجمالی تذکرہ اس سلسلے کی چوتھی قسط ''شعبۂ فارسی وریاضی دارالعلوم دیوبند میں میرے اساتذہ'' کے عنوان کے تحت آچکا ہے۔ مگر وہ تذکرہ بہت مختصر ہے۔

جب میں نے مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے اوران کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، اس وقت وہ درجہ فارسی وریاضی دارالعلوم دیوبند میں استاذ مقرر ہوئے تھے اور میں نے اس وقت ان سے شیخ سعدیؒ کی گلستاں پڑھی تھی۔

جس درسگاہ میں وہ گلستاں پڑھایا کرتے تھے، اس کی بھی ایک دلچسپ تاریخ ہے کسی نے خواب میں دیکھا تھا کہ حضرت سعدیؒ یہاں بیٹھے ہوئے گلستاں پڑھا رہے ہیں۔ان کی یادگار میں وہ درسگاہ تعمیر کی گئی اور اکثر ایسا ہوتا رہا کہ فارسی کے اسی استاذ نے گلستاں پڑھائی جن کو یہ درسگاہ پڑھانے کے لئے دی جاتی تھی۔

خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی اتفاق ہوا کہ فارغ ہونے کے بعد جب مجھے درجۂ فارسی میں مدرس مقرر کیا گیا، تو ابتداءً میں دارالصنائع کے برابر والی درسگاہ ملی، اس کے بعد یہ درسگاہ دی گئی اوراس میں ایک عرصے تک میں نے گلستاں کا درس دیا۔اورآخرتک یہ کتاب میرے پاس رہی۔

بہرحال مولانا سیدحسن صاحبؒ سے ہماری شاگردی کا آغاز درجۂ فارسی میں گلستاں پڑھنے سے ہوا...ابتدائی عربی کے بعد جب میں وسطیٰ میں آیا تو مولانا سیدحسن صاحب بھی فارسی سے وسطیٰ میں آچکے تھےاوران سے ہم نے ''مقامات حریری'' کا درس لیا۔

اس کے بعد ہم دورۂ حدیث میں آئے تو مولانا سیدحسن صاحب اس زمانے میں طحاوی شریف پڑھاتے تھے۔

وہ ہمارے دولہا بھائی بھی تھے، ہمارے والد صاحب کی بھانجی، ہماری پھوپھی زاد بہن صالحہ خاتون سے ان کی شادی ہوئی تھی۔مولانا کی طبیعت میں مزاح تھا۔ہم دونوں میں اس بات پر کبھی کبھی بات ہوتی تھی تو میں کہہ دیتا تھا کہ جتنا میں پڑھنے میں آگے بڑھ رہا ہوں، آپ پڑھانے میں آگے بڑھ رہے ہیں۔جس جماعت میں میں ہوتا ہوں، آپ اسی جماعت میں پڑھانے کے لئے ترقی کرجاتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

مولانا سیدحسن صاحب کے والد مولانا نبیہ حسن صاحب خود ایک بڑی بزرگ شخصیت تھے تقریباً تیس سال تک وہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے۔تفسیر اور حدیث کی بڑی کتابوں کے علاوہ علم ہیئت اور ریاضی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ان کے مزاج میں جذب کا غلبہ تھا۔۱۳۵۱ھ میں تقریباً پچپن سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی۔ان کے پانچ بیٹوں میں مولانا سیدحسن

صاحب ممتاز عالم دین اور صاحب تصنیف وتالیف ہوئے۔ ۱۳۳۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔

مولانا سید حسن صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۵۴ھ میں تعلیم سے فارغ ہوگئے۔ فارغ ہونے کے بعد شروع میں نینی تال کے مدرسہ عربیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۳۶۰ھ میں درجۂ فارسی سے دارالعلوم دیوبند میں ان کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔

ہمارے دینی مدرسوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت ایک لازمی حصہ رہی ہے اور دیکھا جائے تو تعلیم کا مقصد ہی تربیتِ اخلاق ہے۔ تربیتِ اخلاق کے لئے مولانا سید حسن صاحب کا تعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رہا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا کے حقیقی ماموں تھے ان کے واسطے سے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے تعلق قائم ہوا۔ حضرت تھانویؒ نے مولانا کو مجازِ صحبت قرار دیا۔ اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ کا جو مکتوب ہے اس کی فوٹو کاپی مولانا کے صاحبزادے مولانا خورشید حسن قاسمی نے اپنی کتاب ''دارالعلوم اور دیوبند کی تاریخی شخصیات'' میں صفحہ نمبر ۶۴ پر شائع کیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے:

> السلام علیکم حسب معمول قدیم اس وقت بھی بعض احباب کو میں نے اس خدمت کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ شایقین دین کو اپنی معلومات سے دینی نفع پہنچاویں اور ایسی جماعت کا لقب مجاز صحبت رکھا گیا ہے میں نے آپ کو بھی تو کلاً اس سلسلہ کے لئے تجویز کیا ہے بشرطِ ترکِ مزاح لانه یخل بالوقار، لابد انه لا ینتفع عوام المسلمین کما هو مشاهد. امید ہے کہ ایسے طالبین کی طرف توجہ رکھیں، اللہ تعالیٰ مدد فرماوے''۔
>
> اشرف علی تھانہ بھون

----------پوسٹ کارڈ بنام: مولوی سید حسن----------

مدرس فارسی، مدرسہ دارالعلوم دیوبند

ضلع سہارنپور۔

----------مہر پوسٹ آفس دیوبند: ۴؍نومبر ۱۹۴۲ء ----------

مولانا میں ذہانت تھی، لیاقت تھی اور دارالعلوم دیوبند کے کامیاب مدرس تھے۔ ان کی زندگی کا ایک روشن اور تابناک پہلو یہ تھا کہ وہ دیوبند کے مسلک پر ہمیشہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے تھے

اور اپنے درس میں اور اپنی مجلسوں میں ہمیشہ اس کو بہت نکھار کر مدلل طور پر پیش کرتے تھے۔

حدیث اور فقہ میں دارالعلوم کا اپنا ایک مزاج ہے اور ایک خاص ذوق ہے۔ وہ ذوق ایک خاص اعتدال رکھتا ہے، اس میں افراط ہے نہ تفریط ... دیوبند کے علماء بحر حدیث کے شناور ہیں۔ اس کی گہرائی سے جب مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور حدیث کے دروبست کو سمجھ کر مدلل طور پر پیش کرتے ہیں تو ان کی فقیہانہ بصیرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

قابل اور لائق لوگوں کی کمی نہیں۔ مگر دیوبند کے مزاج کو سمجھنے والے اور اس کے ذوق کو پرکھنے والے دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں۔

مولانا سید حسن صاحب نے لمبی عمر نہیں پائی۔ ۲۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ پہلی نومبر ۱۹۶۱ء کو ان کی وفات ہوئی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ بازار سے گھر آئے اور گھر آکر اپنی چارپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ لیٹتے چلے گئے اتنے میں میں اور بھائی منیف صاحب جو کہ ہمارے پھوپھا بابو لطیف صاحب کے صاحبزادے تھے، ہم دونوں پہنچ گئے۔ میں نے یہ سمجھا کہ دولہا بھائی بیہوش ہوگئے ہیں، جلدی سے ڈاکٹر کو لانے کے لئے دوڑا۔ اُس زمانے میں دیوبند میں ایک ہی مشہور ڈاکٹر ہوا کرتے تھے ''ڈاکٹر چنی لال'' ان کا مکان زیادہ دور نہ تھا، ہندواڑے میں رہا کرتے تھے۔ میں دوڑا ہوا گیا، ڈاکٹر صاحب سے جاکر بتایا، انھوں نے کہا میں آتا ہوں تم چلو اور دل کی طرف ان کے سینے کو ملو۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے تک میں اور بھائی منیف صاحب ان کے سینے کے ملتے رہے، جس سے ان کے سینے پر ایک نیلا نشان پڑ گیا، ڈاکٹر صاحب بھی جلدی پہنچ گئے۔ انھوں نے آکر دیکھا، بدن گرم تھا، مگر روح پرواز کرچکی تھی۔

علم اور علم کے ساتھ ذہانت اور ذہانت کے ساتھ عمل اور پھر خدمت کی لگن اپنے مقصد کے ساتھ غیر معمولی شغف، یہ سب چیزیں مل جاتی ہیں تو ایسی شخصیت بنتی ہے، جس کو دنیا صدیوں تک یاد رکھتی ہے۔ اور اس کا فیض دیر تک جاری رہتا ہے۔

مولانا کے ہزاروں شاگرد، ان سے فیض پانے والے اور ان کے علمی سلسلے کو آگے بڑھانے والے، پھر شاگردوں کے شاگرد، ان سب کے اجر وثواب میں وہ صاحب علم شریک ہیں کہ جن کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے۔

دیوبند کے قبرستان قاسمی کی مٹی نہ جانے کتنے لعل وگہر کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ اپنے نانا مولانا محمد یٰسین دیوبندیؒ (والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحبؒ) کے مزار کے جلو میں مولانا

حسن صاحب محوخواب ہیں۔ان کا مزار جیسے زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا صاحب تصنیف تھے،ان کی اہم تصنیفات کا اجمالی تذکرہ ان کے صاحبزادے مولانا خورشید حسن قاسمی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔اس کی فہرست بتارہی ہے کہ مولانا کے قلم نے ہر ضروری موضوع کو چھیڑا ہے اوراس پر اپنی علمی تحقیقات پیش کی ہیں۔

اہم تصنیفات کا تذکرہ پیش خدمت ہے:

(۱) تنویرالحواشی شرح سراجی کامل مع مناسخہ۔
(۲) مصباح المنیر شرح نحومیر اردو۔
(۳) مصباح المعانی شرح شرح جامی اردو بحث فعل۔
(۴) شرح مفیدالطالبین اردو،مع حل ترکیب۔
(۵) تذکرہ سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام قرآن وحدیث کی روشنی میں۔
(۶) تاریخ سیدنا حضرت حسنؓ مع فضائل اہل بیت وحضرت حسنؓ۔
(۷) فضائل وبرکات درودشریف وواقعات اولیاء۔
(۸) تحقیق اسم اعظم شریف۔
(۹) قرآنی دعائیں۔
(۱۰) چہل حدیث استغفار۔
(۱۱) اسرار اسم اعظم کا شرعی فیصلہ۔
(۱۲) ردّ بدعات پر تحقیقی کتاب۔
(۱۳) تنبیہات،مودودی صاحب کی بنیادی علمی غلطیوں پر تحقیقی رسالہ۔
(۱۴) چہل حدیث اسلامی اخلاقی، بخاری شریف کی اخلاق سے متعلق۔
(۱۵) سیرت الصدیقؓ،مع فضائل حضرت صدیق اکبرؓ تاریخ اور سیرت کی اہم کتب سے۔
(۱۶) سجدۂ تعظیمی کی شرعی حیثیت، یہ رسالہ فتاویٰ دارالعلوم قدیم کا جز بن کر، نیز جواہر الفقہ جلد۴ میں بھی شائع شدہ ہے۔
(۱۷) راکٹ سے چاند تک،یعنی خلا کی تسخیر کی شرعی حیثیت اور چاند اور دیگر سیارات کے

آسمانی سفر سے متعلق شرعی فیصلہ۔

(۱۸) تحفۂ معراج، واقعہ معراج سائنس اور شریعت کی روشنی میں۔

(۱۹) ترجمہ المنجد، عالم اسلام کی جن مشہور شخصیات نے المنجد کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے ان مترجمین میں حضرت مولانا بھی شامل ہیں۔

(۲۰) تسہیل آداب المعاشرت۔

(۲۱) تسہیل حیات المسلمین۔

(۲۲) سیرت فاروقؓ۔

(۲۳) شہید کربلا۔

(۲۴) جمالین شرح جلالین۔

مولانا کی جو کتابیں ابھی نہیں چھپی ہیں ان کو چھپنا چاہئے، تاکہ اس کا فائدہ زیادہ سے زیادہ عام ہوسکے۔

مولانا کا انتقال ہوا تو سب بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ بڑے بیٹے مولوی شاہد حسن، وہ بھی ابھی زیر تعلیم تھے۔ دوسرے بیٹے مولوی خورشید حسن اور سلیمان ظفر یہ سب بچے ابھی نوعمر تھے۔ والد صاحب کا معمول تھا کہ مولانا کے انتقال کے بعد تقریباً روزانہ ہی ان کے گھر جایا کرتے تھے اور اپنی بھانجی اور بچوں کا خیال رکھتے تھے۔

یہ اُس زمانے میں اعلیٰ قدریں تھیں۔ قرابت داری کے تقاضے تھے، باہمی تعلق کے احساس تھے، وقت گذر گیا، بچے قابل ہوگئے، اپنے اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ صالحہ باجی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ انھوں نے اکیلے ماں کے ساتھ باپ کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ بڑے بیٹے مولوی شاہد بھی اب نہیں رہے۔ مولوی خورشید اور میاں سلیمان ظفر، الحمدللہ دونوں بچے اپنے والد کے طریقے پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت دے۔

جامع مسجد کے سامنے بکر قصابوں کے محلے میں ان کا مکان، کبھی وہاں ہمیشہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب ہم بھی پردیسی ہوگئے۔ یادیں رہ گئیں، باتیں رہ گئیں، زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دنیا کیسے کیسے قابل لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ چلے جاتے ہیں، یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

❁ ❁ ❁

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا عمید الزماں کیرانوی کی وفات پر

مہتمم دارالعلوم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا پیغام تعزیت

دیوبند: ۲۵ ستمبر

آل انڈیا مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے کارگزار صدر دارالعلوم دیوبند میں علمائے دیوبند کے ہم سبق، عربی زبان وادب کے ماہر، انگریزی زبان پر قابو یافتہ اور خدمت انسانی کے عظیم الشان مشن سے وابستہ عظیم المرتبت شخصیت مذہبی، سماجی شخصیات کے دل کی دھڑکن، ملّت اسلامیہ اور فلاح انسانی کے نقیب، عہد ساز اور نیک سیرت انسان حکومت وقت سے اسلامی مسائل پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے والے مولانا عمید الزماں کیرانوی کے انتقال کی خبر جوں ہی دارالعلوم میں آئی، یہاں کے اساتذہ اور طلبا کے دل ودماغ اس قدر متاثر ہوئے کہ نہ صرف احاطہ دارالعلوم بلکہ آس پاس کے علاقے میں غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔

یہ ہیں وہ تاثرات جو مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مولانا عمید الزماں کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر سن کر آس پاس بیٹھے ہوئے رفقائے کار کے سامنے بیان کئے آپ نے فرمایا کہ وہ ایک عالم کی موت نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کیلئے ایک ایسی دل ہلا دینے والی خبر ہے جس کا اثر عرصہ دراز تک محسوس کیا جاتا رہے گا۔ آپ نے اسے ذاتی، ملّی اور قومی نقصان قرار دیا آپ نے فرائض کے تئیں ایمانداری سے بیدار رہنے اور تعمیری اصولوں کے تئیں دل وجان سے کام کرنے کے آپ کے جذبۂ صادق کو سراہا۔ دارالعلوم میں آپ کے سانحہ ارتحال کی خبر آتے ہی یہاں کے علمائے کرام اور اساتذہ کرام نے مولانا عمید الزماں کے گھر پہنچ کر تعزیت کی۔ دارالعلوم میں ایصال ثواب کا اہتمام واعلان کیا گیا۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مرحوم کے کنبے والوں سے اظہار تعزیت کیا اور مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائی، آپ نے کہا کہ ایسی مثالی شخصیتیں دنیا میں بہت کم اور شاذ ونادر ہی نمودار ہوتی ہیں، بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ سانحہ ارتحال پر تعزیت کرنے والوں میں نائب مہتمم مولانا عبدالخالق سنبھلی، مولانا عبدالخالق مدراسی، مولانا نعمت اللہ صاحب، مولانا مجیب اللہ ناظم تعلیمات، صدر المدرسین مولانا سعید احمد پالن پوری اور دیگر اصحاب گرامی شامل ہیں۔

جاری کردہ دفتر اہتمام
(مولانا) عبدالخالق مدراسی